

اور
کو^ا
پیش
ان!

تنقیدی
مضامین

داؤڈ شفیع



لَوْلَه
كَوْكَبُ
بَلَانْجَيْ
إِنْهَا !

{ تَنْقِيدَعَ }
مَضَاعِفَيْ

كَافِدَ لَشْفَكَ

بلا جنگ بھی صحفہ حفظ

پرنسپ: غوث محمد نٹ

کتابت: محمد غزالی

ابتدائی صفات: متقدم خوش خوبی



تعداد: سات

اشاعت: ۱۹۴۸ء

قیمت: کسلی روپے



مالي اعانت: اردو اکڈی، آندراء پرنسپل - جید آباد

ناشر: شگون فہم پبلیکیشنز

۱۳۔ ہرگز، مغلیہ طایبی مارکٹ، جید آباد ۱



صلفے کے لئے:

اردو اکڈی آندراء پرنسپل، ایسی اکارڈ - جید آباد

ایکس ٹریڈرز، شاہ عالم جید آباد

محنتہ بائس، قتلیں روپے، بھی ۲



فہرست

کچھ بیال اپنا	6
محمد قلی کی شخصیت اور شاعری	11
غالب کا حُنین طلب اور حُسین احمد	19
مخدوم — ایک ادھورا مطہرہ	32
ترجمہ اور اُس کی اہمیت	34
اقبال اور تصور و طنز	49
ڈاکٹر زورا اور ان کے شخصیتی سارے نامے	58
اردو کی ایک بے بدل شخصیت)	
نہست برلن میں دو اموریہ کیفیت)	۶۴

٨٠ ————— مخدوم چند یادیں

ریڈ یاٹی مَضَامِین

۸۸ ————— اسد اللہ و جہت

۹۵ ————— الظاف حسین حائل

۱۰۳ ————— اسرار الحن مجتاز

۱۱۰ ————— مخدوم مجی الدین

والد بزرگوار

علی اشرف، صاحب

میر روزنامہ تنظیم

کے نام

— کوچھ بیال اپنا !

"اور کچھ بیال اپنا" میری دوسری تصنیف ہے، جس میں ۱۹۶۵ء - ۱۹۶۶ء کے دران میں تحریر کردہ تنقیدی اور ریڈیاٹی معاہدین کا انتخاب شامل ہے۔ میری پہلی کتاب "مختتم — ایک مطابع" ۱۹۶۷ء کے آخر میں شائع ہوئی تھی اور اب بارہ ماں بعد "اور کچھ بیال اپنا" منتظر عام پر آ رہی ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی جو فحشا ہے، اس کے مقابلہ میں درج ذکر فحشامت کی کتاب بھی شائع ہو سکتی تھی، لیکن میں نے فی الواقع متذکرہ مدت کے دران میں لمحیٰ گئی اپنی تحریروں کے انتخاب کو شائع کرنے والی مناسب سمجھا۔

اس کتاب کا پہلا مضمون "محمد قلی کی شخصیت اور شاہری" ہاہناہر پونڈ کے اکتوبر ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ "غالب سماں طلب اور حسن اعراض" —

شگفتہ کے غائب نمبر ۱۹، ۱۹۶۵ میں اور "ترجمہ اور اس کی اہمیت" نیا دُور، لکھنؤ کے شہرہ نومبر ۱۹۶۵ میں شامل تھا۔ "اتبال اور تصور و طفیل" جو کئی رسائل میں شامل ہو چکا ہے، ہسلہ بام ۲۷، ۱۹ میں شامل تھا۔ "ڈاکٹر زور اور ان کے تحقیقی کارنالیٹ" کے نیز نگوان مصنون ۱۹، ۱۹۶۵ میں ادارہ ادبیات اور کے نیز اہم منعقدہ "یوم زور" کے موقع پر ایوان اردو حیدر آباد میں پڑھائیا تھا جو "سب رسن" میں بھی شامل تھا اور اس کے نامور شاعر اور عوامی رہنا خندوم مجی الدین رعوم پر اس کتاب میں تین مظاہیں شامل ہیں۔ تین مظاہیں تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ اس مختصر کتاب میں ان مظاہیں کو شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں پہلے پہل اپنے مطالعہ مخدوم کی وجہ سے ہی ادبی دُنیا میں مصروف ہوا ہوں اور شلیکہ اپنی پہلی کتاب "مخدوم — ایک مطالعہ" کے توسط سے ہی خود راستہ جانا پہچانا جاتا ہوں۔ یہ مظاہیں اس مطالعہ کے تسلیں کو ظاہر کرتے ہیں۔ "مخدوم" ایک ادھورا مطالعہ "مخدوم" کے انتقال کے بعد قلببند کیا گیا تھا جو "نیا آدم" کے مخدوم نمبر میں شامل تھا۔ "مخدوم — چند یادیں" — روزنامہ سیاست، حیدر آباد میں اور ریڈیو ای ای مصنون "مخدوم مجی الدین" روزنامہ "رہنمائی دکن" میں شامل تھا۔

کتاب کے نام کے لیے غالب ہے محرر بخوبی

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنی"

کے ایک حصہ کو خود سے سے تصرف کے ساتھ اپنایا گیا ہے۔ لفظ "پھر" میں تبدیلی ضروری تھی۔ غالب جیسا عظیم فن کار اپنے اندازہ بیان کے لیے بجا طور پر "پھر" کا استعمال کر سکتا تھا، لیکن مجھے جیسے لکھنے والے کے لیے "پھر" کی بجائے "کچھ" کا انہماری بہت کچھ ہے۔

اردو کے مصنفین کو عام طور پر یہ شکرہ رہتا ہے کہ جوش و جذبہ کی حرارت کے طفیل ان کی کتابیں شامل تو ہو جاتی ہیں، لیکن بہرہ مردست بازار میں ان کے جگہ کے مکملوں کو خریدنے والے مشکل ہی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ میں اس اعتبار سے خوش نصیب ہوں کہ میری پہلی کتاب "مخدوم — ایک مطالعہ" کی بعد مدار چندیں شامل

ہوئی تھیں اور اب میرے پاس صرف چند جلدی ہی باقی رہ گئی ہیں۔ لیکن یہ صورت حال میرے ذمہ قلم پاٹھن بیان کا نتیجہ نہیں۔ یہ سارا جاودہ لفظ "مخذوم" کا ہے۔ یہ صاری کشیش اُس ممتاز شاعر اور علامی رہتا، اُس کی شخصیت اور فن سے تعلق رکھتی ہے۔ میری دوسری پیشی کش "اور کچھ بیان اپنا" کے لیے اگر مجھے انہمار پسندیدگی کے کچھ بدل دیں تو میں اُسے بھی اپنی خوش نصیبی پر محول کر دیں گا۔

میری پہلی کتاب کا دیباچہ جاپ باہگار ڈی نے تحریریں مخابو اُس وقت انجمن تحفظ اُردو آندھرا پردیش کے صدر تھے۔ آج وہ ریاست آندھرا پردیش کے وزیر پیغامیت راج اور ریاستی اُردو اکیڈمی کے صدر ہیں۔ اسی محبت اُردو کی پڑھائی میں اور جاپ چدر سریواستاوہ بھی بے زث، پڑھشی اور فعال سکرٹری دائرکٹر کی انتحک کاوشوں کے نتیجہ میں آندھرا پردیش میں اُردو زبان و ادب کے تحفظ، ترقی اور اشاعت کے لیے حالات اور بھی ساز بھار بن چکے ہیں جس سے اُردو زبان اور ادب کے خدمت گزاروں کے حوصلے یقیناً بلند ہو گئے ہیں۔ جاپ سید مصلحہ اکمال دیر، مشکنہ، کی ٹھنڈنگوں صرف دنیا کی دیکھنے ہوئے میں اپنی کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں اُن پرمزید کام کا بوجہ ڈالنا نہیں چاہتا تھا، لیکن اپنی ابتدائی کوششیں ناکامی کے بعد مجھے اپنا ارادہ بدلتا پڑا۔ اُن سے دیر میں اور گھر سے مراثم کے پیشی نظر ان کے تعاون کے بیے یہاں روایتی اور رسمی انداز میں انہمار تشكذہ تو مناسب معلوم ہوتا ہے اور نہ ضروری حسابِ دوستیاں دردیں ...

کتابت کے لیے خلص و محنتی خوشنویں، محمد غالب، ٹائیپل کے لیے اپنی طرز کے منفرد ٹھنڈنگ کار غوث محمد اور طباعت کے لیے نیشنل فائل پرنگ پرین ان سب کا میں مشکر گزار ہوں۔

ناشکر گزاری ہو گی، اگر میں اس بات کا اعتراف نہ کر دیں کہ اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی مالی اعانت، کتاب کی اشاعت کے لیے مدد معاویہ کی۔

” یہ اپنی یہ کتاب والد بزرگار علی اشرف صاحب مرحوم مدیر روزنامہ منظیم کے نام معزون کرتا ہوں، کیوں کہ لکھنے پڑھنے کی حادث مجھے ان ہی سے درثہ میں ہے اور اس سے زیادہ بہت سی تیس آنٹہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

دلقداً شرف

۱۹۶۸ء۔ مارچ۔

سلطان پورہ

حیدر آباد

محمد قلی کی شخصیت اور شاعری

محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کو اس کی شاعری کے آئینہ میں دیکھنا بخوبی ہر آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت بہت مشکل ہے کیونکہ اس کی شاعری میں ایک شاعر کے جذبات اور محسوسات کی جملک، ہی نظر نہیں آتی بلکہ زندگی محمد ندیگی کے حین کی ہر ہر لانا اور بالکل پر سو طرح سے نشانہ ہونے والے اثرات کا حل بھی دھڑکتا ہوا لفڑاتا ہے۔

ایک عظیم تہذیب کے باñی، حکمران و عاشق کے مختلف روپ اور مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی شاعری میں دریا کی سی رسمت ہے۔ جس کا خدا اس کو بھی پورا پورا احساس ہے جس طرح ہر وقت دریا میں موجود ہوتا رہتی ہیں اور اس کے باوجود اس کی روانی میں فرق نہیں آتا۔ اسی طرح اس کے ذہن میں بھی تخلیقی عمل کی موجود ہمیشہ احتی رہتی ہیں اور ہزاروں اشعار موندیں کرنے کے بعد بھی شامر کی طبیعت کی روانی متاثر نہیں ہوتی۔

اُردو کے اس پہلے صاحبِ دیوان شاعر کی شخصیت سے جب تک

ہمیں مکمل طریقہ لگا ہی نہیں ہو جاتی ہم اس کی شاعری کے تنقیدی جائزتے میں انھاں نہیں کر سکیں گے۔ محمد قلی قطب شاہ بظاہرا ایک جلیل القدر بادشاہ ہے جسے دنیا کی تمام آسامیشیں اور نعمتیں، عیش و آرام، نیک نامی، شہرت، عنایت و رفعت، شان و شوکت و بدبہ جاہ و جلال سب کچھ نصیب ہے۔ مہ جبلیوں، حسینوں اور رفاقتاءوں کی ولناوازیاں، حسن و شباب کی انگڑائیاں اور دل فریباں اس کی ایک لگاہ توجہ کی محتاج ہیں۔ مخفیہ کے غصہ کی ہر گونج، قرن کی مشھاس، نرمی اور حلاوت سب اس کی ایک جنسی شب کے آرز و منڈ ہیں۔ یعنی تمام باقیں اس کی شخصیت کو سمجھنے میں معادن ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن یقول پر فیض احمد شام حسین محمد قلی کی دہ "در ویشنہ ادا" ہمارے لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اس کے تہذیبی اور ادبی کاموں میں جلوہ گر ہے اس نے سچی ہندوستانی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور اپنی دُور رسم لگا ہوں سے اس ہندوستان کو دیکھ لیا تھا جو آج وہ بننا چاہتا ہے۔

محمد قلی کی زندگی اور شاعری کے بارے میں ہماری معلومات کچھ سال پہلے تک نہ ہونے کے برابر تھیں۔ داکٹر نور مرحوم نے "کلیات قلی" سے ہمیں روشناس ذکر لایا ہے تو اور دو کے ادبی اور لسانی ارتقاء کے اہم زمینہ اور ایک بنیادی گزی سے ہم ناواقف ہی رہتے۔ نور مرحوم کے اس کانٹے سے نہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک ناقابل فراموش باب کا اضافہ کیا۔ لیکن تحقیق و تجسس کرنے والوں کے لیے ابھی بہت کام باقی ہے۔ محمد قلی کی شخصیت سے جوانسائی وابستہ ہیں ان کی تحقیقت

کا پتہ لگانا اور جو رعایتیں چلی آرہی ہیں ان میں صداقت کی تلاش اردو ادب کا ایک اہم تقاضہ ہے۔ اس کے بعد ہی ہم محمد قلی کی شاعری پر تنقید کا صحیح حق ادا کر سکیں گے۔ تنقید ایک مشکل فن ہے شاعری جیسے فن لطیف پر تنقید اور بھی مشکل کام

ہے۔ محمد قلی کی شاعری پر تنقید کے لیے محمد قلی قطب شاہ کے مشور کا ملکی تاریخی جائزہ لینا ہوگا۔ اس کے دور کی تہذیب پر نظر رکھنی ہوگی۔ اس کے تخلیقی ذہن کی نفسيات کا صحیح اندازہ لگانا ہوگا جو ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ ہم کیونکریہ تصور کر لیں کہ زندگی کا ہر حلیش و آرام میسر ہونے کی وجہ سے محروم کا کوئی گلہ ہی نہ ہو گا۔ تنهایی کا حساس صرف بندگرہ ہی میں نہیں ہوتا بلکہ بھری عقول میں بھی ہو اکرتا ہے۔ بازار کی چہل پہل اور دن قیمت روح کی تنهایی اور تشنگی کبھی کبھی زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ جس کے جلوے ہمیشہ نظروں کے سامنے بکھرتے ہوئے ہونے کے باوجود محمد قلی کی آنکھیں جس کی اس ایک ادا کے لیے بھی بے جین ہو سکتی ہیں جو آرٹسٹ محمد قلی کے دل پر انہیں نقش چھوڑ کر شعری تخلیقات کے بے شمار لمحوں میں اس سے نادر ہو گئی ہوا اور جس کے لیے شاید چڑھتے دریا کی طفانی موجود ہیں بھی چھوڑا لے کر کو دپڑا ہو، گویا پکے گھرے کے سہارے ”طفانی دریا کو عبور کرنے کی کوشش کی ہو۔ بادشاہ ہوتے ہوئے اپنے عشق کو جزن کی آخری حدود تک لے جانے والے کردار کی نفسيات کا تجزیہ ناممکن نہ ہی لیکن دشوار ضرور ہے۔

محمد قلی کی شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ نہ صرف اس کی منظومہ نوعی حیات ہے بلکہ اس کے عہد کی ایک تاریخ بھی ہے اس لیے ہم اپنی محدود معلومات کے سہارے ہی اختیاط کے ساتھ اس بھرنا پیدا کنار کی موجود کو گنتا ہو گا۔ محمد قلی کے سامنے دکھنی یا قدیم شاعری کے ابتدائی نقش تھے۔ اس نے سب سے پہلے دکھنی نیاں میں ادب کو پیش کرنے کی باقاعدہ کوشش کی جس کی وجہ سے اس کو اپنے لیے خود راستہ بنانے اور سلنجے تیار کرنے پڑے۔ اس اعتبار سے وہ بانی بھی ہے اور موجود ہم اس نے ایجادات بھی کی ہیں اور اجتہاد بھی۔ سب سے زیادہ حیرت انگریز بات یہ

ہے کہ ابتدائی میں اس کے یہاں انتہا کا ادراک ہوتا ہے۔ ابتدائی میں اس نے شاعری کے فن کو دستیں دی ہیں۔ بہ صفت سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل اور قصیدہ کے علاوہ رباعیات، قطعات، مشنونی اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ صرف یہ بات نہیں کہ اس نے ہر صفت سخن میں طبع آزمائی کی رسم نیا ہی ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انتخاب مضامین کے معاملے میں بھی اس کی شاعری کا کیوں حیرت انگیز حد تک وسیع معلوم ہوتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری سے روشناس ہونے کے بعد اب ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی شاعری کی یہ بیانادی کڑی اتنے طویل ہر حصے تک ہماری نظر وہ سے او جھیل نہ رہتی تو ارداد اور شاعری کی عظمتوں اور فحول کا آج کس درجہ بلند مقام ہوتا۔ ارداد میں جن عناصر کی کمی ہم صد ہارس تک محسوس کرتے ہے ہیں وہ عنابر محمد قلی قطب شاہ اور اس کے بعد کے دور کے دکھنی ادب اور شاعری میں بڑی اہمیت رکھتے تھے، لیکنی ادب کی ہندوستانی رسم، ہندوستانی تصورات، مقامی زنگ، خوبصورتی، بانسکیں اور تنوع کا اندازہ اگر بہت پہلے ہو جاتا تو ارداد اور شاعری بہت پہلے ہی ان ملندیوں اور دستیوں سے ہمکار ہو جاتی جہیں وہ آج بھی حاصل کرنے کی سعی میں صرف ہے۔

محمد قلی کے دوسری زبان سے ہم مانوں ہیں اگر اس بات کو اور لفظی متردکات اور ناہماری کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کے شعری ترمیم، موسیقی اثر اور دلنشیزی کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ اس کے سامنے اصناف سخن کے سانچے موجود نہیں تھے۔ اس لیے اس کی طبع روان تجربوں اور ایجاد و اختراع کی طرف مائل تھی۔ اس کے لیے یہ کام شکل بھی نہ تھا۔ ایک طرع سے اسے اس کام پلا جا رہ تھا۔ شاعر یا فن کا رہنمایی طور پر اپنی ذہنی تسلیکیں اور اپنی ردیع کی

تکنیک کو درکرنے کے لیے لکھا ہے وہ حسن کی تخلیق سے خود محفوظ ہونا چاہتا ہے لیکن اگر اس سے یہہ احساس رہت کہ اس کی تسلیم دوسروں کی تسلیم کا باعث ہو رہی ہے اور اس کے فتنے سے دمرے کے احساس کو بھی تازگی اور انبساط عاصل ہو زرمائے تو وہ بہت متاثر ہو جاتا ہے۔ اس کے جذبہ میں گئی اور تخلیل میں بار تعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت اسے مزید تخلیقات کے لیے تحریک و ترغیب کا کام دیتی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ ایک بڑا شاعر ہی نہیں تھا بلکہ دلوں پر حکمرانی کرنے والا تاج دار بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے چاہنے والے بے شمار تھے بہت سے خوشایندی بھی ہوں گے جو اس کے فن کی عظمت کو سمجھے بغیر بھی مخفی چاپلوسی اور شاہی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے سرچھتے ہوں گے۔ لیکن یہہ ایک واقعہ ہے کہ وہ اپنے ہستے اور پسند کرنے والوں کی دلبتگی اور اپنے اشعار کی پسندیدگی سے متاثر ہو کر بھی شعر کھٹا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دکھنی میں اس نے پھاپ ہزار سے زیادہ شعر کہے تھے اور فارسی اور تکنیکی میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کا دور تاریخ کا وہ دور تھا جب مسلمان اپنے آپ کو اپنی سمجھنے کی بجائے اسی سرزین کو اپنادھن اور اسی آب دلگی کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگا تھے۔ ادب کے معاملہ میں ایرانی روایت، عربی اور ترکستانی نقوش، مسلمانوں کی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب، رنگ اور مزاج سے بھروسہ عناصر میں جو اس تراجم محمد قلی کے عہد کے ادب میں ملتے ہوں اکبر کے زمانے کے تہذیبی اہم ترکیب اور آہنگ کے مقابلے میں زیادہ قدرتی، زیادہ حقیقی، زیادہ موثر اور زیادہ دوسری تھا۔ ہندوستان کی تہذیبی اور معاشرتی تاریخ جب بھروسہ اور مکمل اذان

میں لکھی جائے گی۔ تب ہم اس تہذیبی استرایج اور ہم آہنگی کا پورا پورا اندازہ کر سمجھیں گے۔ اس تہذیبی اور تاریخی پس منظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد قلی کی خواہی کے قلب میں ہمیں اس دور کی تہذیبی دھرم کی خصائص سنائی دیتی ہیں اس کی شاعری میں جہاں حسن و عشق کے معاملات کا بیان ملے گا، وہیں عوام کے معتقدات عید دن اور تہوار دن، بازار دن اور تماشوں، کھیلوں اور عام رسم و معاشرے کی جملہ کیاں بھی ہل کش انداز میں ملیں گی۔ اس کے کلام میں درباری شان و تمہارے اور محلات کی رنگینیوں کا بیان باغوں کی سرسیزی و شادابی اور شہر کی خوب صورتی اور خصوصیات کی تفصیل درحقیقت اس دور کی تہذیب و تمدن کے نقوش کو اپنی شاعری میں ابھارنے اور جلپکانے کی ایک فن کا راستہ سمجھیے۔ یہ کام کسی بڑے اور ماہر فن کار کی دروس لگا ہیں ہی انجام دے سکتی تھیں۔ اکٹھیم مشترکہ تہذیب کے باñی کی حیثیت سے اس کی نظر میں جو دعوت ہمن چاہیے تھی وہ اس کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا در محمد قلی کے مقابلہ میں بہت بعد کا وعدہ ہے۔ محمد قلی کے بعد تقریباً دھانی سو سال کے عرصہ میں صرف نظیر بھی ایسا شاعر نظر آتا ہے جس نے اپنے داد کی زندگی، تہذیب، معاشرتی طور پر یہ توں اور رسم و ملل کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اگر قلی قطب شاہ کے دور کی دلکشی زبان میں زیادہ جان ہوتی، اور پنجھی محیارات اور موز دل سانچے اس کے سامنے ہوتے تو اس کی خواہی عنیم میں سکتی تھی۔ اس نے اپنی شاعری میں بالعموم سچی تصویر کشی کی۔ اس کا مشاہدہ ہمیں تھا کیون بلکہ شاہ مہمنہ کی وجہ سے وہ ان تجربات سے گزر نہیں سکتا تھا اور اسی دار دا تھے محدود تھا جو باڈشاہ نہ رکھنے کی صورت میں اس کے حصہ میں آتیں

اداس کے غم ذات کا جز بنتیں۔ اس کی شاعری محض تھیں کی شاعری نہیں بلکہ اس کے جمالیاتی شعور کی آئینہ دار تھی۔ اس کا تہذیبی مزاج اس کے شان دار محلوں کی حسن کا رامہ سجادہ اور آرائستگی اس کے خوابوں کے شہر کے حقیقی اور جیتنے جلدگتے روپ میں بہر جگہ بلندی پر نظر آتا ہے وہ اپنی شاغری میں غیر مبہم انداز میں واضح کر رہا ہے کہ وہ حسن سے متاثر ہو کر ہی شعر کرتا ہے۔ یہ حسن اس کی نازک انداز اور خوبصور دشیز اول اور سر جو لوں ہی کا حسن نہیں بلکہ یہ اس تہذیب کا حسن یعنی بے چواس سے عزیز تھی۔ لیکن جہاں تک ماحول کی عکاسی کا تعلق ہے اس کی شاعری میں وہ سب جلوے کو ندتے نظر آئیں گے جو اس کے محلوں اور عشرت کو دل کی روشنی تھی اس کے یہاں حسن دعشق کے معاملات کا بیان بے ساختہ ملتا ہے۔ اس نے عورت کے حسن کو اس کی تمام تر کشش اور جاذبیت کے ساتھ پیش کیا ہے وہ نشاط اور سر درا در سہاروں کا شاعر ہے زندگی اور حسن کے مشاہد کو جذبہ کی حرارت اور تھیں کی مدد سے شعری خلیفی میں تبدیل کر دینا محمد قلی کے آرٹ کا کمال ہے۔

ایک حکمران ہونے کی وجہ سے محمد قلی کو شاید اتنی فرصت نصیب نہیں تھی کہ وہ سلطنت کی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تمام صلاحیتیں اور تو انایاں اپنے فی پر صرف کر سکے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں ایسے اشعار کی تعداد بھی کم نہیں جو محض بھرتی کے شعر ہیں۔ کہیں کہیں لفظوں کے تلفظ میں ناہماری اور معنی میں اختلاف بھی ملتا ہے الفاظ اور خیالات کی ناؤار تنکار اور بسطی بھی لصحت کی ہے۔

اس بھی شک نہیں کہ اس کے کلام میں نکر کی وہ گہرا ہی اور انہریان کی وہ صنایع نہیں ملتی جو بعد کے اردو شعراہ میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی بنیادی

وہ زبان کی ابتدائی شکل اور کھرد را پن ہے اور یہہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہر زبان کے ابتدائی درمیں اس زبان کے لکھنے والوں کو اسی قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غالب بھی اپنی فکر کی گہرائی کے لیے آج سے سو اسوسال پہلے کی زبان اور شاعری کے فارم کی تنگ دامتانی کے شاکی تھے۔ محمد قلی کو تو یہ شکل دامن تھا نہ ہی میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس کا دور تقریباً پونے چار سو سال پہلے کا در ہے۔ فکر میں گہرائی نہ ملنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی نظر میں جلوہ مائے صدر تنگ تھے اسی لیے اس کی نگاہ ہر جلوہ کا باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ نہیں کر سکی۔ پس بھی اس کا دل شاعر کا، اس کی نظر مصروف کی اور اس کا حوصلہ کو د کرن کا تھا۔ اس کا ذہن ایک با تدبیر حکمران اور ایک ایسی تہذیب کے نمائندہ اور رہنمای کا ذہن تھا جس کی رہنمائی فزوں لطیفہ کی ترقی کی کی خواہ تھی

غالب کا حسن طلب اور حسر اعراض

غالب کی شاعری اور نثر کی نمایاں خصوصیات ان کی دلادویز شخصیت کے کئی پہلو اباگر کرتی ہیں۔ ان کی عظمت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ وہ ہر رنگ میں حصی کہ "تصویر کے پردہ میں بھی" اپنے اندر کے حیوان طریفہ کو چھپاتے ہیں۔ عربیاں کر دیتے ہیں۔

غالب نے شاعری کو قافیہ پہاڑی نہیں معنی افزی سمجھا۔ اپنی شاعری کو عظیم عالمی شاعری کے درجہ تک پہنچایا اور اس کو ہمارا اہم تہذیبی ورثہ بنایا اور مکتوب نویسی کے ابتدائی دور ہی میں الذکھا، ردال اور بیت تعلفانہ طرز تحریر اختیار کر کے ایسا زنگار نگ چمنا کیا جس کے مچھول اپ تک تازہ و شکفتہ ہیں اور بہار دے رہے ہیں۔

میرزا نے پابندی رسم درہ عام سے ساری زندگی گر زیکیا۔ فرسودہ اور روایتی دلگر پوچھنے کی بجائے جدت پسندی سے کام لیا۔ ان کی یہ خصوصیت ان کے یہاں طلب اور اعراض میں بھی نمایاں ہے۔ راست طور پر وہ کوئی چیز کم

مانگتے ہیں۔ ان کے خلپوڑ شاعری یا الطیفون میں حسن طلب کی اکثر مثالیں ہوتی ہیں۔ اگر طلب راست انداز میں ہوا وہ مانگنے کا ڈھنگ سادہ اور سپاٹ ہو تو اس میں بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ میرزا کی فطری نظری نظرافت و شوخی، بارہت کہنے کا زوال ڈھنگ، بات میں بات پیدا کرنے کی کوشش نے طلب میں ایک خاص لطف دخوبی پیدا کر دی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس خاص انداز میں طلب کرتے ہیں کہ انکا بین نہیں پڑتا۔

میرزا صرف مانگنا اور طلب کرنا ہی نہیں پہنچتے تھے دوسروں کی خود اور خواہش پورا کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ جہاں انھوں نے اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور شاگردوں سے حوال کیا ہے۔ وہیں انھوں نے ان لوگوں یا دیگر لوگوں کی فرمائشیں پورا کرنے میں بھی کوئی دقتراہما نہیں رکھا۔ عمر کے آخری حصہ میں بیماری اور ضعف پھری کے باعث بستر پر لیئے لیئے شاگردوں کا جھیجا ہوا کلام پڑھتے اور اصلاح دیتے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں کو یہ حدیثی رکھتے تھے۔ ان کی خوشی پر مسرو بردار ان کے دکھ درد پر نجیدہ ہو جاتے تھے۔ بعض اوقات ان کے احباب اور شاگرد ایسی فرمائشیں کر لیجاتے تھے جنھیں پورا کرنے میں کسی وجہ سے انھیں تامل ہوتا تو ایسی صورت میں وہ ایک خاص انداز میں پہلو بچانے کی کوشش کرتے۔ کیونکہ فوجت اور مردوں کے پیکر تھے اور اپنی کسی بات سے دوسروں کو نجیدہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس لیے وہ جواب میں عام طور پر صاف الکار سے پرہیز کرتے ہیں اور بات ٹالنے کے لیے کوئی نہ کوئی دل چسب نہ کہہ دھوندھونکلتے ہیں۔ جب کسی کی فرمائش پورا کرنے میں وہ خود کو معمول پاتے ہیں یا کسی کے ارادہ کو ناپسند کرتے ہیں تعالیٰ صورت میں مکتوب الیہ کو فرماش

یا ارادہ سے باز رکھنے کے لیے مشورہ و نصیحت کرتے ہیں۔ لیکن ان کا مشورہ کر دو دوا کی مانند نہیں ہوتا جسے پینے سے منہ کا ذائقہ بگڑتا ہے یا مسٹہ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بات ظرافت کے پردے میں کہتے ہیں تاکہ "اگوار نہ گزرے اور بد مزگی پیدا نہ ہونے پائے۔

ظرافت غالب کی شخصیت کا ایک اہم ترین وصف ہے۔ شوخی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یہ شوخی و ظرافت خاص خاص موقعوں اور موضعوں کی پابند نہیں۔ میرزا کسی بھی واقعہ یا بات میں اس کے مضائقہ یا تفریحی پہلو ابھارتے ہیں۔ دکھ درد کا تذکرہ ہو کر یونچ وافسر دگی کا بیان، ان کا قلم شوخی اور رد افی کو نہیں بھولتا۔ غم کے موقع پر آزادہ اور رنجیدہ خاطر ہو کروہ آہ وہ کا نہیں کرتے بلکہ اس میں مزاح کا پہلوں کا لکر غم کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بسٹر علاالت اور بسٹر مرگ سے بھی جو خطوط انہوں نے تحریر کیے ہیں ان میں میرزا کی فطری ظرافت اور شکفتگی اپنا جو ہر دکھاتی ہے۔ سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل حالات میں مذاق کا سوجھنا غالب جیسے جیوان طریف ہی کا حصہ ہے ان کے اردو خطوط کے مطالعہ سے یہ چلتا ہے کہ انہوں نے مکتب الیکٹرونیکس کرنے اور اس کے دل بہلانے کا التزام کیا ہے۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ میرزا کو اس اہم سماجی ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا اور وہ اس ذمہ داری سے پوری کامیابی کے ساتھ عمدہ یہا ہوئے ہیں۔ میرزانے اسی پر کتفا نہیں کی بلکہ وہ اس سے بھی چند قدم آگے نکل گئے ہیں۔ دوسروں کا مذاق اڑانا آئے ہے۔ لیکن خود پر ہنسنا یا خود کو مذاق کا نشانہ بنانا، اعلیٰ ظرفی اور بلند حوصلگی کی بات ہمیں یہ درکھا ہے کہ اس "جیوان طریف" کی فطری ظرافت طلب اور اعراض

میں کس حد تک ان کا ساتھ دیتی ہے۔ دیکھیے آیا وہ اونچی آواز اور کرخت ہجے میں صدابلند کرتے ہیں یا دل چیپ اور دل لبھانے والے انداز میں سوال کر کے حاجت روکو سرورا درستخ کر لیتے ہیں۔ کسی کی فرمائش کہبے مردوئی سے رد کرنے ہیں یا اظر بغاۓ اندازا ختیار کر کے پہلو بجا نے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں طلب اور اعراض میں بھی ظرافت، شکفتگی اور ذہانت جلوہ گرتے جس میں مزاج کی ہلکی ہلکی آمیزش شکفتگی اور جدت پسندی نے ایک انوکھا پین پیدا کر دیا ہے۔
شاعری میں وہ "در کعیہ وا" نہ ہونے پر ضرور لوث آئیں گے۔ لیکن

اپنے خطوط میں اور خصوصیت کے ساتھ طلب یا اعراض کے لمحوں میں وہ زندگی کے حقائق اور واقعیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ حاجت روکا دردا نہ ہونے پر اسے بار بار کھٹکھٹانے کی حرکت کر سکتے ہیں۔ ان لمحوں میں شخصیت سے فرار بھی ممکن ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا ان لمحوں میں وہ اپنے رکھ رکھا اور وضع داری کو بھاتے ہیں یا صرف غرض مند سوالی بن جاتے ہیں شاعری کے مقابلہ میں خطوط کے توسط سے غالب کی شخصیت کو کردار اور زندگی کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی ہے طلب اور اعراض کے موقعاً اس معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ اہمیت کے عامل بن جاتے ہیں۔ یہاں تصنیع، بنادٹ، خوشاب پسندی، ظاہرداری اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ ظرفی، طبیعت کی فطری شوغی، خودداری انسانیت، مزاج کا پانچیں اور بھیر کی شکفتگی غرض یہ کہ یہ تمام خصوصیات اور ان کے تضادات کا تجزیہ اور یہ طے کرنا کہ آیا یہ حالات کی ستر ظریفی غالب جیسے ایک عنطیہ فن سکار کی ٹریکٹری، مالیوں اور محرومی کو ظاہر کرتی ہے یا ان کی شخصیت کے کھو کھلے پن اور قول و فعل کے تضاد کو بے نقاپ کرتی ہے ایک علیحدہ موجود ہے۔ یہ صنوں طلب و

واعراض کی صور اس خصوصیت تک محدود ہے جو اس حیوان فلسفی، اُن فطری شوئی، مائیگن اور انکار کرنے کی
دل پر سلیقہ تسلیکتہ انداز اور ان سپ۔ پر چڑھے ہوئے ہلکے ہلکے ظراحت کے
رنگ سے متعلق ہے۔ جس پر کہیں کہیں تیکھے طنز کی چمک ملتی ہے مزاج کے گل
بٹے بھی جس پر نقش میں۔ یہی غالب کی منفرد خصوصیت ہے۔ سپاٹ یا بناوٹی
قسم کے روایتی انداز سے سب کراں کوں نے جدا گانہ ردش یہاں بھی اختیار کی
ہے۔ اسی انوکھے پن نے ان کی نثر میں شعر کی سی مترجم روانی پیدا کر دی ہے۔
حسن طلب اور حسن اعراض کی چند مثالیں جو کہ بیشتر خطوط سے لی گئی
ہیں پیش خدمت ہیں:

علام الدین احمد خاں کے نام یہ خط حسن طلب ہی کا ہنسی غالب کی
دل کش طرز تحریر کا ایک بہترین نمونہ ہے خط ملا حظہ فرمائیے:
”یہاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں
پاخانہ ڈھے گیا۔ چھستیں ٹیک رہی ہیں۔ تھہاری پھوپھی کہتی ہیں۔
ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔
میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدر ان راحت سے کھیراتا ہوں۔ چھت
چھلنی ہے اب دو گھنٹے بے سے تو چھت چار گھنٹے برمی ہے۔ مالک اگر چاہے
سرمت کرے تو کیونکرے مینہ کھلے تو سب کچھ ہوا در بھر اٹھائے مرمت میں میں
یہاں کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے
مجھ کو وہ حوالی، جس میں میرسی رہتے تھے اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور
کوئی بھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالان زیریں جو الہی بخش خاں مرحوم کا
مسکن تھا۔ میرے رہنے کو دلوادو۔ برسات گزر جائے گی۔ مرمت

ہو جائیگی۔ پھر صاحب اور میم اور بایا لوگ نے اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے تھمارستے والد کے اشارو عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک پہہ مردت کا احسان میرے پایان عمر میں اور بھی سہی۔

اس خط میں طنز، نظرافت اور ہجہ کا انداز ملتا ہے۔ یہ ہجہ کسی اور کی نہیں ان کے اپنے مکان کی ہے اس طرح یہ اپنے حال زار پر ہنستا۔ بھی ہے۔ بیان کا انداز طرفیاً نہ ہے۔ غالب کا یہ بیان کہ مرتنے سے نہیں ڈرتے فتوانی راحت سے گھبرا تے ہیں۔ ان کے کردار اور وضع داری کی طرف اشارہ ہے اس خط میں گذارش احوالِ واقعی اور انداز طلب دونوں باوقار ڈھنگ سے ملتے ہیں۔ غالب نے کسی نواب کے یہاں سے اپنے خط اور قصیدہ کا جواب نہ لئے پر ایک دل چسپ قطعہ لکھا ہے چھسی طلب کا ایک شاہکار ہے۔ اس قطعہ میں اخنوں نے ایک چھوٹی سی تمثیل بنائی ہے۔ اس تمثیل میں غالب مالیوس ہو کر اپنی عقل کو مخاطب کرتے ہیں کہ وہ شمع پڑھا غیر ہفت الیوان ہے۔ اسے تو کچھ خبر ہو گی کہ خط کا جواب کیوں نہیں آیا۔ غالب کے استفسار پر جو خط اور قصیدہ لکھتے پڑیں یا نہیں۔ عقل نے جواب دیا شیطان کافر بہ نہ کھادا اور مالیوس نہ ہو۔ اصل میں نواب اور فران کی فکر میں ہے اور جو کچھ وہ دیتا چاہتا ہے اس کے اکٹھا کرنے میں دیر ہوتی ہے۔ نواب نے تیر فرمان جاری ہی کر دیا ہے کہ بھروسہ کے تمام راستوں سے پوری کوشش کر کے

لئے غالب ان کی بیگم اور بچے
لئے خطوط غالب مرتبہ خلام رسول نہر صد

دمشق سے دیبا، روم سے محمل، معدن سے الاس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی،
کوہستان سے زمرد، عراق سے لکھڑا، عمان سے موئی، نیشاپور سے فیر درہ،
بدخشاں سے یاقوت، بنداد سے اُونٹی۔ اصفہان سے تلوار، کشیر سے پشمیسہ، ایران
سے زربفت فراہم کر کے لائیں۔ ظاہر ہے اس سارے اسباب کے لکھا کرنے
میں دیر ہوئی جا رہی ہے۔ جب عقل نے انھیں اس طرح تسلی دی تو ان کی مایوسی
امید میں بدل گئی اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ جب محمد رحیم رے لیے یہ سب
چکھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اس کے لیے سکندر سے تاج اور آئینہ سلیمان سے تخت
اور انگوھٹی، عالم غیب سے جام جہشید، چشمہ خضر سے آپ حیوان، عمرابد، لشاط جاودہ
دل کی قوانانی اور ایمان کی سلامتی اپنے خذے سے اپنی عرضی کا جواب اور قصیدہ کا سلسلہ
محمد رحیم سے کیوں نہ مانگوں؟ ۱۰

میرزا آمول کے بہت دلدارہ تھے۔ آم کے موسم میں ان کے دوست
احباب انھیں عمدہ عمدہ کام بھیتے تھے اور وہ خود بھی دوستوں سے آم بھیتے کی فرش
کیا کرتے تھے۔ میرزا نے جو فارسی خط علیٰ اکبر متوالی امام پاڑہ ہنگلی بندروں کو آمول
کی طلب میں لکھا تھا وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

”کسی قدر پیٹ کا بندہ ہوں اور کسی قدر نا توں۔ آرائش خواں
چاہتا ہوں اور آرائش جاں بھی۔ عالمہند جانتے ہیں کہ یہ دو نوں
صفتیں آم کے اندر موجود ہیں اور اہل کلکتہ کا دعویٰ ہے کہ ہنگلی بندر
قلدر دانہ ہے۔ ہاں ہنگلی سے آم گلشن سے گل، جناب سے ایثار

اپنی جانب سے سپاس۔ شوق یہ چاہتا ہے کہ ختم موسم تک دو تین بار
خاطر دلی نعمت سے یہ بات گزرے اور حرص یہ رد تی ہے جا شا
اس قدر میوہ خودی پر بھی میں خوش نہیں ہوں گی۔" ۱۷

غالب نے کہا تھا

اس پہ بین جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
اُس خط میں یہی خواہش آم کے تعلق سے اور آم بھیجنے والے کے تعلق سے
پائی جاتی ہے۔ طلب کرنے والے کا یہ انتہائی دل چسپ انداز ہے اس حسن طلب
کے کیا کہیے،

"ایک روز مر جوم بیان در شاہ آموں کے موسم میں پندرہ صاحبوں کے ساتھ
جن میں میرزا بھی تھے باعث حیات بخش یا امہتاب باعث میں ٹھیل رہے
تھے۔ آم کے پیڑ رنگ بزرگ کے آدم سے لد رہے تھے۔ یہاں کام
بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔
میرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا
میرزا اس قدر خور سے کیا دیکھتے ہو؟ ما تھہ باندھ کر خرض کیا پیر و مرشد
جو کسی بزرگ نے کہا ہے

بسر ہر دانہ بنو شرہ عیان

کا اس فلاں این فلاں این فلاں

اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے پاپ دادا کا نام بھی لکھا

ہے یا نہیں۔

بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک بہتگی عمدہ حمدہ آموں کی مزماں کو بھجوائی۔^{۱۰}
اس واقعہ میں ہی حسن طلب کی داد بہادر شاہ ظفر کی طرف سے میرزا کو آموں
کے تحفہ کی شکل میں مل جاتی ہے۔ غالب اپنے حسن طلب کے ذریعہ کیا حاصل نہیں
کر سکتے۔

نواب یونس غلی خاں بہادر نے حیدر علی خاں بہادر کی شادی کے موقع پر خلعت تھدہ
کے لیے میرزا کو ۳۵ ارب روپے بھیجے ہے۔ میرزا نے ان روپیوں کو صرچ کر لیا اور آمدہ
کی سبیل لکھ لئے تھہرے لکھتے ہیں:

”یہ تحریر نہیں مکالہ ہے گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت
در کے لاطر یقیناً انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سوا سورپے جو توہ و خلعت کے نام
سے مرحمت ہوتے ہیں، میں کمال کامارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا اور اس میں
اپاں نہ بناؤں گا تو میرا خلعت حضور یاتی رہے گا یا نہیں سہ
تم سلامت رہو ہزار بر سر
ہر بر سر کے ہوں دن پچاس ہزار

دار کاظم

غائب ہو

یہ دل چسپ طرز تحریر دا قی تحریر نہیں مکالہ ہے۔ طلب میں مزاج کا

لئے یادگار غالب از حالی صدھ

لئے مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، طبع سوم صدھ لکھوپ نواب فردوس مکان
لکھوپ نمبر ۲۴

پہلو انوکھا بھی ہے اور نور بھی۔ ایسے حسن طلب کے بعد شاید ہی کوئی انکار کرے۔

تو اب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کے انتقال کے بعد کلب علی خاں بہادر مسند نشین ہوئے۔ میرزا کلب علی خاں بہادر کی مسند نشینی کی سرست میں قصیدہ تہذیت لکھ رہیجا تھا۔ لیکن دیاں سے صلحہ پانے میں تاخیر ہوئی تو وہ والی رام پور کو لکھتے ہیں۔

"پیر و مرشد احضرت فردوس مکان کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتاں اس کی رسید میں خط تحسین دا فریں کا، شرم آتی ہے۔ کہتے ہوئے مگر کہے بغیر شمی نہیں، والاصھ کی ہندو دی اس خط میں ملفوظ ہوا کرتی تھی..... یہ شرم بری نہیں اگر جاری رہے تو بہتر ہے"۔ اے

اس خط میں طلب تھا اذین چکی ہے لیکن طلب کا انداز شاعرانہ ہے۔

"یہ رسم بھی نہیں اگر جاری رہتے تو بہتر ہے" سے خوداری ٹکنی ہے۔ غالب طلب اور تقاضا کے شدید لمحات میں اپنے مقام اور مرتبہ کو یکسر فراموش نہیں کر دیتے میرزا قرضوں کے باعث بے حد پر لشیان رہا کرتے تھے۔ والی رام پور نواب کلب علی خاں بہادر سے وہ راحت کے طلبکار ہیں۔ ان سے وہ نہ صرف قرض کی رقم مانگتے ہیں بلکہ مستحق تباہ میں بھی اس قدر اضافہ چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے اخراجات کی پابجائی کے لیے آئندہ قرض نہ لینا پڑے۔ خط ملا حظہ کیجئے۔

حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت ناگتا ہوں اور راحت مخصوص اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے اور آئندہ قرض نیئے کی حاجت نہ پڑے۔

لئے مکاتیب غالب از مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی طبع سوم حصہ

اپنے دو جملوں میں بات کہنے کا سلیقہ ہے لیکن باوقار انداز اور میرزا کے مخصوص شکھستہ انداز اور لہجہ میں نیت میں یہ طلب "شاعری سے کم نہیں۔"

عارف کے چھوٹے بیٹے حسین علی خاں کی شادی کے اخراجات کے لیے میرزا نے نواب کلب علی خاں کے پاس فرما دیتے تھے۔ شادی رجب میں مقرر تھی جواب نہ ملنے پر ملعوی کردی گئی۔ میرزا اور راجح اللہ علیہ السلام کو تقاضا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی۔ عصیہ حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملعوی رہی۔ آج جو زی قعدہ کی ہے ۱۵ دن یہ اور مہینا ذری الحجر کا۔ اگر اسی ذی قعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائیں گے تو آخر ذری الحجر تک نکاح ہو جائے گا۔ خدا کریے! خداوند کے ضمیر میں یہ بھی لگزدی سے کہ غالب جب بہو سیاہ لائے گا تو اس کو روٹی کھاں سے کھلاے گا۔ عرض اس سے یہ ہے کہ حسین علی خاں کی تنخواہ جاری ہو جائے۔ حضرت! کوئی ایسا نہیں کہ جو بیرون مطاب حضور میں عرض کرتا ہے اور مجھے یار بار لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

اس خط سے شدید ضرورت، حاجت اور موقع کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میرزا نے روایتی انداز اختیار نہیں کیا۔

حکی نے یادگار غالب میں جو دافعہ، لطیفہ کے زیر عنوان بیان کیا ہے وہ حسین طلب کی ایک مثال ہے۔

"ایک دن دیوانِ فضل اللہ عالیٰ مرحوم چشت میں سوار میرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ میرزا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک رقصہ دیوان جی کو لکھا۔ آج بھوکاں قدر نلامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمیں میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی

ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گذریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔ جب یہ رقصہ دیوانِ جی کے پاس پہنچا وہ بہت شرمذہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سور ہو کر میرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

اس واقعہ میں غالب کے طفیل کا تیکھا ہیں ملتا ہے۔ دا قدر یہ ہے کہ نہ امتحان کو نہیں ہوی بلکہ فضل اللہ غالب صاحب کو ہوئی۔ اور غالب کے طفیل نے ان میں شدید در عمل پیدا کرنے کی وجہ سے کچھ دھاگہ سے باندھ کر انھیں غالب کے یہاں پہنچا دیا۔ میرزا نے ایک بار تفضلِ حسین خاں سے اپنا دیوان مانگا تھا۔ دیوان نہ دیسے جانے پر خفت ہو جاتے ہیں اپنی ناراضی کا نہایت شاستری کے ساتھ انہما رکرتے ہوئے دیوان دوبارہ طلب کر رہے ہیں۔

"کیوں صاحب

یہ چھا بھتیجا ہونا اور شاگردی اور استادی سب پر پانی سمجھ گیا؟ اگر کوئی ہزار پالسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے نے تم کیا غصب ڈھانتے، میرا کلام خریداً لٹھ دی روپیر کی سودہ بھی میں نہیں کہتا کہ مجھ کو دیے ڈالو۔ تو کو مہارک رہے مجھ کو مستعار دو۔ میں اس کو دیکھ لوں، پھر تم کو دا پس بیج دوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اخبار نہیں یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستان بدل طلب ہے۔ وہ کتابِ ابھی میرے آدمی کو نہیں دے دے۔ یا نہ دو اور اس میں جو میر پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو پس نہ دوں تو مجھ پر عنت اور تم میری قسم نہ ماننا اور کتابِ حاملِ رفقہ کو

نہ دو تو تم کو آفریں لے

یہ خط جدا گانہ نوعیت کا ہے اور اس خط کی تحریر بھی غالب کی نظر کے اچھوٹے انداز کی نمائندہ تحریر یہ سمجھی جا سکتی ہے۔ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جن موقعوں پر اُدی بھلا اُخت ہے دہائی بھی غالب نے اپنے مزاج کے اعتدال اور شلگفتگی طبع کو اپنے چلنے نہیں دیا ہے۔ لہنسز بھی کرتے ہیں تو گران ہیں گذرتا اور کسی کے چذباثت مجرموں نہیں ہوتے۔

منشی ہرگوپال نقۃ فارسی کے شاعر اور میرزا کے بہت عزیز شاگرد تھے۔ اُردو میں غالب کے سب سے زیادہ خطوط انہی کے نام ہیں۔ انہوں نے ایک بار میرزا سے اپنے دوسرے دیوان بر تقریظ لکھنے کی فرماش کی تھی۔ اس کے جواب میں میرزا نے جو مکتب لکھا تھا وہ میرزا کا شاعری کی جانب جو روایہ تھا اس کی واضح طور پر ترجمانی کر لی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شاعری قافیہ پہمای کے لیے وقت گزارنے یا دل بہلانے کی خاطر کی جائے۔ وہ شاعری کے لیے غور ذنکر، چھان پھٹک، اور خود احتسابی صفر دری سمجھتے تھے۔

اس خط میں خاص بات یہ ہے کہ تلقین و تنقید سے متعلق ذرفی باتیں اور بیش قسمت مشعر سے دل چسپ اور برجستہ انداز میں ملتے ہیں۔ یہاں صاف گوئی بھی ہے اور کھڑی کھڑی باتیں بھی لیکن اس مخصوصہ انداز میں کہ دل تو ٹھنڈے نہ پائے

"صلاحب!

دیباچہ اور تقریظ کا لکھنا رسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان

لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خرچ کرتے ہوا اور کیوں چھپو اتے ہو؟ اگر یوں ہی جی
چاہتا ہے تو بھی کہے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان تھصپاکر
اور دوسرے دیوان کی فکر میں پڑے گے۔ تم دو چار برس میں ایک دیوان
کہہ لو گے۔ میں کہاں تک دیباچے لکھا کر دیں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان
کو اُس دیوان کے برابر ہو لینے دواب کچھ قصیدہ اور رباعی کی فکر کیا کرو۔
دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جائے، دوسرے دیوان میں
اس کو بھی درج کر دے۔

نواب علاء الدین خاں علائی نے میرزا سے اپنے لڑکے کی ولادت کی تاریخ
اور اس کا اسم تاریخی نظم کرنے کی فرماش کی تھی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔
”شیرا پس بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طرق صدید انگنی سکھاتا
ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ حسن طبع
خدا دادر کھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیرزادہ
دل کو زکلیف رو۔ علاء الدین خاں، تیری جان کی قسم، میں نے پہلے
لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہمنے
گھیرا ہے کہ میری نخوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا محمد درج جیتا نہیں۔
نصیر الدین حیدر اور احمد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیئے۔
واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی
درج میں دس میں قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے چاہنچا

نہ صاحب، رہائی خدا کی، میں نہ تاریخ دلا دت کہوں گا، نہ نام تاریخی
ڈھونڈوں گا۔ لہ

یہ خط پکار پکار کر کہتے ہے کہ میرزا جدید اور دن شر کے بانی و خالق تھے۔ اتنی
روایت اور حسین نشر آج بھی کا ہے کہ دیکھنے کو ملے گی۔ یہ میرزا کا منفرد اشائی ہے یہاں
آنکار ہے پہلو تھی ہے۔ لیکن کس خوبی کے ساتھ۔ آنکار میں ایسی تحریر یا نسے والا آنکار کے
باوجود اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس خط میں میرزا کا طنز و مزاج
بنتے ساختہ اور دل کو لمبھانے والا انداز بیان۔ غرض یہ کہ سب کچھ مل جاتا ہے۔
”کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

مخدوم۔ ایک ادھورا مطالعہ

۵۵

جامعہ عثمانیہ میں ۱۹۶۵-۶۶ء کے تعلیمی سال کے دورانِ ایم۔ لے (آخری) کے امتحان کے لیے جن ادبی شخصیتوں پر مقامے لکھے گئے انہیں مخدوم بھی شامل تھے جنہوں نے جامعہ عثمانیہ ہی سے اردو میں ایم۔ لے کیا تھا اور جن کے دورِ طالب علمی میں حیدر آباد کی اس عظیم درس گاہ سے جدید حیدر آباد اور اس کی جدید تہذیب کے نقوش اُبھرے تھے۔ نئی روایات شروع ہوئی تھیں۔ ایک ایسا ماحول پیدا ہوا اور ایک ایسی فضلا تیار ہوئی تھی جس نے حیدر آباد کی ساری زندگی کو نئے ساپخون میں ڈھالنا شروع کیا۔ جامعہ عثمانیہ سے اپنے اس گھرے تعلق کی دمیرے بھی اردو ادب اور شاعری کی یہ قد آور شخصیت اس بات کی مستحق تھی کہ اس پر اس کے وطن میں ہی اور اس کی اپنی جامعہ میں تحقیق کی جائے۔ رسمی طرح کیا ہائے۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ نے اپنے ایک بہترین فرزند کو اس کی زندگی ہی میں موزوں خراج تھیں ادا کیا۔

یہ اگست ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے امتحان یم لے
 (آخری) کے لیے مجھے بہ حیثیت طالب علم اپنے مقابلے کے موصوف سما
 انتخاب کرتا تھا۔ میرے ساتھی موصوف کے انتخاب کے سلسلہ میں اس
 وقت کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں سے مشورہ کرنے اور
 اجازت حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ مجھے سے بھی کہا گیا تھا کہ موصوف
 کے بارے میں سوچ کر ڈاکٹر صاحب سے ملوں۔ مخدوم صاحب کا
 انتخاب کرنے میں مجھے دیر نہیں ہوئی۔ اسی طرح حصول اجازت کا مرحلہ
 بھی تیزی کے ساتھ ٹے ہو گیا۔ سب سے پہلے تو میں نے اپنے استاد نعمت
 ڈاکٹر عبدالحفیظ قیل سے مل کر ارادہ ظاہر کیا تھا کہ میں مخدوم پر کام کرنا
 چاہتا ہوں۔ میں اردو کے اس بڑے شاعر اور حیدر آباد کی اس عہدہ ساز
 محبوب شخصیت سے ملے حصہ میں مبتاثر ہوں اور اسی کی شخصیت اور فن کو ہی
 موصوف بنانا چاہتا ہوں۔ مخدوم کے ماحول سے قریب رہنے اور حیدر آباد
 کے "رستوں" جلسہ گاہوں اور ادبی ایوانوں میں بر سہاب برس سے چلتے والے
 مخدوم کے تذکرے اور چرچے سننے کے بعد مخدوم کے مطالعہ کا خیال
 میرے لیے فطری تھا۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ قیل نے میرے انتخاب کو پسند کیا۔
 ہی نہیں بلکہ قیل صاحب نے میرے حوصلے بھی بڑھائے۔ اس کے بعد
 جب میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبہ سے ملا تو ڈاکٹر صاحب نے بھی
 ان الفور میرے موصوف کو منظور کر لیا۔ میرے دوسرے ساتھی کی کمی بار
 پہنچنے موصوف بدلتے تھے۔ لیکن میرے لیے موصوف تبدیل کرنے کا سوال
 ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کیونکہ مخدوم میرا پسندیدہ موصوف تھے۔

مخدوم صاحب کے ماحول سے قریب رہنے اور پرسوں تک ان کے جلسوں، مشاعروں اور دوسری ادبی تہذیبی اور سماجی نشستوں میں شرکت کے باوجود ان سے مل کر دیر تک بات چیت میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ لیکن اپنے کام کے سلسلے میں ایسا کرنا میرے لیے صفر دری تھا۔ مخدوم سے ملنے اور اخفیں قریب سے دیکھنے اور ان کے بارے میں بہت سی باتیں جاننے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ مخدوم ایک بڑے شاعر ہی نہیں ہیں۔ ایک بہترین انسان بھی ہیں۔

میں جب پہلی بار مخدوم صاحب سے ملنے کی غرض سے ان کے گھر گیا تو اس وقت میں ان کی شخصیت سے ہر خوب تھا اور اپنے آپ کو زد محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس وقت گھر پر موجود تھے۔ اطلاع ملنے کے پچھر ہی دیر بعد باہر آئے۔ پڑھ کر مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔ میں نے مختصر طور پر اپنا تعارف کرایا اور غرض بیان کی۔ سُن کر سہنے لگے۔ اور ایسے لب و لہجہ میں گفتگو کی اور اس سادگی اور انکساری سے ملے کہ سارا NERVOUSNESS نہ سنس ختم ہو گیا اور میری ہمہت پڑھی۔ انہوں نے میری باتیں توجہ سے سنیں۔ مجھے قابل اعتنا سمجھا اور مسکراتے ہوئے جوابات دیئے۔ میں آئندہ تفصیلی ملاقات کے لیے دن اور وقت مقرر کر کے وہاں سے لوٹا۔

میرے بعض ساختیوں کو جو ایسے ادیبوں اور شاعر فل پر مقابلے کر رہے تھے جو بقیدِ حیات تھے شکایت تھی کہ انھیں اپنے مقابلوں کے لیے ان ادیبوں اور شاعر اکا مکمل تعاون حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن میں اس سلسلہ میں خوش قسمت تھا کیونکہ مجھے مقابلے کی تیاری میں مخدوم صاحب

سے بھر پور تھا دن ملا۔ صرف ایک بارا ہم مصروفیت کے باعث وہ مقررہ د پر مجھے وقت نہ دے سکے۔ دوسری طرف دوبار ایسا بھی اتفاق ہوا کہ خود میں ان سے وقت لے کر ان کے پاس نہ جا سکا۔ فون پر ربط پیدا کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ میرے منتظر ہیں۔ مجبوری بیان کر کے میں نے معذرت چاہی۔

پہلی دفعہ انٹر دیو دینے کے لیے مخدوم صاحب نے مجھے صبح آنکھ بجھے گھر پر بلا یا تھا۔ میں سوا آنکھ بجھے ان کے گھر پہنچا۔ پستہ چلا کہ وہ میرا انتظار کر کے پارٹی آفس جا چکے ہیں۔ مجھے شرمندگی اور حیرت ہوئی۔ شرمندگی اس لئے کہ میں مقررہ وقت پر نہیں پہنچ سکا تھا اور حیرت کی وجہ یہ تھی کہ مخدوم ۸ بجے تک ناشتا وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر چاچکے تھے۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ شاعر مخدوم صبح دیر تک سوتے ہوں گے اور ۱۱ یا ۱۲ بجے گھر سے باہر نکلتے ہوں گے میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اتنے پا بند اور اصولی آدمی نکلیں گے، ان کی زندگی میں اتنی باقاعدگی اور اتنا سلیقہ ہو گا۔ میں ان کے گھر سے پارٹی آفس پہنچا۔ گھر پر دریے سے پہنچنے کی معاافی چاہی اور دریافت کیا کہ کیا وہ مجھے کچھ وقت دے سکتے ہیں۔ مخدوم تیار ہو گئے اور ہم قریب کے ایک کافی ہاؤس میں بیٹھ گئے۔ اس وقت میرے ساتھ ایک سوال بنتا تھا۔ جس میں مخدوم کے حالات زندگی اور شاعری کے بارے میں بیسیوں سوالات درج تھے۔ تاکہ مخدوم کا بلکہ میرا وقت بھی بچے اور کام میں ربط اور ہم آہنگی رہے۔ مخدوم تقریباً ایک گھنٹہ تک سوالات کے جواب دیتے رہے۔

ایک بار میں مخدوم صاحب کے دینے گئے وقت پر گھر پہنچا۔ وہ ایک چھوٹی بھی سے بیٹھے ہوئے کھل رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس بھی کو باغ عاملہ

لے جانا ہے وہاں کچھ تصویریں کھینچوانے کے بعد بھی کون خود م صاحب نے نصرت کے ذریعہ گھر روانہ کر دیا اور تم بہت دیر تک باقی عالمہ کے ایک گوشہ میں بیٹھے رہے۔ میں سوالات پوچھتا چاتا اور خود م صاحب۔ کبھی مختصہ اور کبھی تفصیل سے جواب دیتے۔ بعض سوالات کا انھوں نے بہت کھل کر جواب دیا تھا۔ ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہ سوالات کی نوعیت اور جوابات دیتے وقت اپنے مود کا خاص خیال رکھتے تھے۔ زندگی کے گزے ہوئے ایام کی یاد تازہ کرتے وقت وہ اپنے سارے وجود کے ساتھ اس طرح میں پہنچ جانا چاہتے تھے جن سے ان یادوں کا تعلق ہوتا۔

مقالے کے مکمل ہونے تک خود خود م صاحب سے کچھ اور ملاقاتیں رہیں اور جب میرا مقالہ مکمل ہو گیا تو سب سے پہلے خود خود م صاحب نے خواہش کی کہ وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ امتحان گزر گیا۔ احباب کا اصرار تھا کہ خود م پر لکھے گئے مقالے کو میں کتابی شکل میں شائع کروں۔ میرا خیال تھا کہ جو مطالعہ میں نے کسی حد تک امتحان کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ہے اسے فی الفور شائع کر دینے کی بجائے اس شخصیت کا بھروسہ مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ اس کی زندگی کے مختلف اجزاء جمع کرنے چاہئیں۔ ان کی شاعری اور فکر و فن کا تفصیلی جائزہ لینا چاہیے۔ اس کے بعد کہیں ایک ضخیم کتاب شائع کی جاسکتی ہے۔ لیکن میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ خود م پر میں نے جو کام کیا ہے اسے جلد از جلد معمولی رد دبدل کے بعد شائع کر دینا چاہیے کیونکہ خود م جیسی قداً در شخصیت کی زندگی اور شاعری پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ خود م اور ان کی شاعری پر مضافاً میں بھی کم لکھے گئے ہیں۔ خود م پر لکھنے والوں

کی سہرات کے لیے کتاب کی شکل میں بہت سا ضروری مواد ان کے سامنے ہونا چاہیے۔ پھر انہم اس استدلال یا ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے "محمدوم" - ایک مطالعہ کے نام سے کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کتاب کی رسم اجراء کے موقع پر ایک پُر اخواز تقدیریب منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب میں محمدوم کوئی نے بڑھتے ہی اچھے سمجھ دیکھا۔ اس تقدیریب میں انھوں نے اپنے بارے میں جوابیں لکھی تھیں وہ میرے دل پر نقش ہو کر رہ گئی ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ضخامت بتاتے ہوئے کہا کہ وہ تو چاہتے تھے کہ ان پر لکھی جانے والی کتاب بہت زیادہ صفحیم ہو۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے جس ضخامت کا اشارہ کیا تھا وہ مولوی عبد الحق کی ڈکشنری کی ضخامت سے کچھ کم نہ تھی جب کہ میری کتاب مقابلہاً بہت ہی سلسی تھی۔ اسی کتاب کی اشاعت اور اس پر مہاذکرہ بالا تقریب اور دوسرے موقوں پر کیے گئے تبصروں اور مشوروں سے متاثر ہو کر میں چاہتا تھا کہ "محمدوم" - ایک مطالعہ "کو حقیقی معنی میں ایک تفصیلی اور بڑی حد تک مکمل مطالعہ میں تبدیل کر دیں اور مولوی عبد الحق کی ڈکشنری جیسی ضخامت والی صفحیم اور مولوی کتاب شائع کی جائے جس میں محمدوم کے کلام کا انتخاب اور ان کے بعض اہم خطوط ان کے کہے ہوئے لطیفے اور بہت کچھ ہو۔ بعض قریبی دوستوں سے اس بارے میں گفتگو کی تھی کہ مجھے پھر سے محمدوم صاحب سے ملا پڑے گا اور ان کی کتاب زندگی کے اوراق جو منتشر ہیں ترتیب دار اور تاریخ دار جمع کرنا ہوں گے۔ ایک نیا مطالعہ شروع کرنا ہو گا۔ لیکن ابھی یہ نیا مطالعہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ محمدوم صاحب کے قلب پر اچانک شدید جملے کی منحوس اطلاع میں اور چند لمحنے بعد یہ معلوم ہوا کہ محمدوم اب نہیں رہے۔ کسی کے

۳۰

دہم دگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ جوابی ہمارے ساتھ تھے کس طرح
”نہیں رہے“ کہلائے جاسکتے ہیں۔ کاش یہ اطلاع غلط ثابت ہوتی۔ کوئی اس
افواہ کی تردید کرتا لیکن یہ ایک حقیقت تھی موت کی طرح اٹل۔

۰۰

ترجمہ اور اُس کی اہمیت

جگری دور میں بھی ہر انسان کی کوئی نہ کوئی بولی ہوگی، مختلف گروہوں کی مختلف بولیاں ہو سکتی ہیں، اداۓ مطلب کے لیے بولے جانے والے صوتی اشاروں میں اختلاف کے پیدا ہوتے ہی، ترجمہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور ضرورت تو ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ ابتدائی تہذیب سے ہی انسانی روابط کے ایک اہم ادارے کی حیثیت سے کار فرمائے اور ترجمے کی تاریخ اتنی بھی قدیم ہے جتنا کے انسانی تاریخ ہے۔ ترجمے کے فن سے انسانیت نے جو فیض اٹھایا ہے۔ اس کا کوئی مٹھکا نہ نہیں۔ اگر یہ فن نہ ہوتا تو آج ہمارا علم محمد درہوتا اور انسانی تعلقات اتنے گھرے اور وسیع نہ ہوتے۔ ترجمے کے فن نے تاریخ میں جو اہم ترین روپ ادا کیا ہے اس کی داستان اتنی طویل ہے کہ اسے ایک مختصر مضمون میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے، تاہم یہ مضمون ترجمے کے کار و بار کے پھیلاؤ، اس کی اہمیت اور اثرات سے متعلق ہے۔ اپنی زبان میں کتابیں تصنیف کرنے کی اہمیت مسلمہ ہے لیکن سابقہ انسانی تجربے کی روشنی میں دیگر زبانوں کے تراجم کی

حضرودت اور افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی صرف "ا فلا طوں کوئی جانے کا دعوے کرے تو وہ یقیناً ا فلا طوں کو بھی صحیح معنوں میں نہیں جانتا، اپنے آپ کی پہچان کے لیے بھی دوسروں کو جاننا حضرودت ہوتا ہے، تقابلی مطابع نے معيارات اور امکانات کو جنم دیتا ہے، کسی تخلیقی کام کا ترجمہ بھی ایک تخلیقی عمل سے مشابہ ہوتا ہے اور تجربہ کے عمل کے قطع نظر اصل تخلیق کے خارجی لباس کی تبدیلی نئی تخلیقات کی تحریک بھی ہو سکتی ہے۔ اس اعتبار سے دیگر زبانوں کے ادب کے تراجم نواہ وہ کلاسیکی ادب کے ہوں یا جدید ادب کے غیر معمولی اہم اور مفید ہوتے ہیں، یہ تراجم ادبی اتنی کوہی سمع ترکریتے ہیں اور ایک عالمی و کائناتی تصور پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں تعلیم یا فتوہ اثر ادعا م طور پر جس غیر ملکی زبان سے واقف ہیں وہ انگریزی ہے۔ اس لیے ہمارا ملک اس موارد ہی سے زیادہ استفادہ کر سکتا ہے۔ جو انگریزی زبان میں موجود ہے۔ دیگر غیر ملکی زبانوں کا ادب ہو کہ جدید علوم کے باعث میں معلومات، ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ انگریزی تراجم ہی کے ذریعہ آسان ہے۔ اگر بازار سے خریدی ہوئی پیشہ اور بارت کے ترکیب استعمال کے پیچے انگریزی کی وجہے جمن زبان یا کسی اور یورپی زبان میں ہوں تو ان ادویات کا بڑے پہیا نے پر عام استعمال کیوں کر ممکن ہو سکے گا۔ اسی طرح اگر سائنس، تکنالوجی اور خلائی تحقیقات پر سیر查صل مواد اور دیگر فنی کتابیں روسی زبان میں ہندوستان بھیجی جائیں تو ان سے دیکھ پہیا نے پر کس طرح استفادہ کیا جاسکے گا۔ درسی اور فنی کتابیں، ادویات، مشتری آلات ماذرار وغیرہ کے استعمال و استفادہ بین البلدان کی روکا دٹھن کو ترجیح ہی کے ذریعہ دوئے کیا جاسکتا ہے۔ سائنس کی ترقی کے سبب کچھ دنیا

بہت سکھ گئی ہے۔ جن طرح اقوام اور ممالک آج کے زمانے میں ایک دوسرے کو بہت کچھ دیتے اور لیتے ہیں اسی طرح مختلف زبانوں کا ادب بھی ایک دوسرے کو بہت کچھ دیتا اور حاصل کرتا ہے۔ ولیکر زبانوں کے اعلیٰ اور معیاری ادب کو اپنی زبان میں منتقل کرنے سے نہ صرف یہ کہ مختلف قوموں کے زنگارانگ ادبی خزانوں سے دلچسپی ہوتی ہے بلکہ اس سے ذہن اور کردار کو ایک نئی تربیت کی مسترست بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ تراجم جس زبان کے ادب کا جز بنتے ہیں اس کو اپنے حسن سے مالا مال بھی کر دیتے ہیں، جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے عالمی ادب کے تراجم سے یقیناً اس کا دامن وسیع ہو گا اور اُردو زبان نے بچانات و تحریکات اور جدید افکار و اسلامیت سے روشناس ہو گی۔ اردو میں فارسی، عربی اور انگریزی کتابوں کے تراجم کثرت سے موجود ہیں، ان کے علاوہ سنسکرت، ہندی اور علاقائی زبانوں کے ترجمے خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ روسی، فرانسیسی، جرمنی اور ترکی زبانوں کی بھی بہت ساری کتابوں کے ترجمے کیے گئے ہیں جو یا تو مختلف اداروں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں یا انفراد کی کوششوں کا حاصل ہیں، اردو میں ترجمہ کی رفتار کو تیز کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اردو میں ترجموں کی تعداد دیگر ترقی یا فتح زبانوں کے مقابلے میں بہت کم ہے، اردو میں پڑھنے اور مصنوع کے معیاری کتب کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ علاقائی زبانوں کے معیاری اور نمائندہ تصانیف کا ترجمہ بھی ضروری ہے، قومی یا جمہی کی خاطر اس کی بڑی اہمیت ہے، ہماری زبان میں طبیعتی، حیاتیاتی اور سماجی علوم کا سرمایہ زیادہ نہیں ہے اس کے لیے بھی ترجمہ کا سہارا لینا ہو گا، جہاں عربی اور فارسی کی صنطیحات کے ذریعہ جدید علوم اور سائنسی علوم کا بہتر طور پر ابلاغ ممکن نہیں، عربی اور فارسی کی بجائے انگریزی سے صنطیحات مستعار لینی ہوں گی یا پھر ایسی اصطلاحات کو

جوں کا تعلق اپنا لینا چاہیے جو عالمی اصطلاحات بن چکی ہیں۔ یہ اصطلاحات روپی زبان کی بھی ہو سکتی ہیں، جس میں یا کسی دوسری زبانوں کی بھی کا آج کے برقرار رفتار زمانے میں مخففات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ انگریزی زبان میں نئے الفاظ کے داخلہ کے مقابلہ میں مخففات کے اضافہ کی رفتار حیرت انگریز حد تک تیز ہے آج کی اس دنیا میں سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگریز ترقی کی وجہ سے نئی معلومات میں اضافہ کی رفتار اتنی تیز ہے کہ صد سال کی جمع کردہ معلومات کو اگر ایک ترازو کے پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں گذشتہ چند سال کے عرصہ میں پیدا ہونے والی نئی معلومات کو رکھا جائے تو کوئی عجیب نہیں، تازہ معلومات کا پلڑا ہی جھک جائے۔ اداۓ مطلب میں کم سے کم ادنیوں تین الفاظ کا استعمال اور مخففات سے بھر لوڑ استفادہ آج کے دور میں ناگزیر بنتا چاہ رہا ہے۔ اس طرح ترجیح کافی آج ایک باقاعدہ اور سائنسی فن بن جائے سائنسی اور ٹیکنیکل موضوعات پر لکھی گئیں کتابوں کے ترجمہ کے لیے ضروری ہے کہ مترجم علم پر عبور رکھتا ہو جس پر کتاب لکھی گئی ہے۔ ان تلاجم میں نظریات اور تصویبات کی صحیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے خیال صحیت کا تجزیہ ان موضوعات کے ایسے ماہرین سے کروانا ہو گا جو زبان پر بھی قدرت رکھتے ہوں اور بیانات کا ترجمہ علمی اور سائنسی موضوعات پر لکھی گئیں کتابوں کے ترجمہ سے زیادہ مشکل ہے اور خصوصیات شاعری کا بعضیں کا تو خیال ہے کہ ایک زبان کی شاعری کا دوسری زبان میں ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا، یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے کہ تخلیق کا ہر عمل ایک طرح سے ترجمہ کا عمل ہے۔ کیونکہ آرٹ بجائے خود کسی غیر صدق تجربہ کو صدقی شکل دینے کی کوشش کا نام ہے۔ ترجیح میں ہم تخلیق کے ایک نوی

عمل پر کار بند رہتے ہیں، ترجیحے کے عمل میں مترجم کسی ایک زبان کے وجدانی تجربے کی دوسری زبان میں بازاً فرنی کی کوشش کرتا ہے۔

ترجمہ ہر کس دنکس کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے بعض صورتیں اور شرائط درکار ہیں مثلاً جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے وہ مترجم کی مادری زبان ہوتا ہے، مترجم کو ملتے جلتے تجربے اور تحلیل کی بازاً فرنی کرنی چاہیے مادرے کے لفظی ترجیحے کی بجائے ملتے جلتے مادرے کا استعمال کیا جانا چاہیے، چونکہ کسی زبان میں دو لفظ ایسے نہیں ملتے جو مکمل طور پر ایک دوسرے کے متادف ہوں تو کس طرح ایک لفظ کا بھرپور متادف دوسری زبان میں مل سکتا ہے۔ اس لیے مترجم کو فریب المعنی الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ کسی انگریزی کی کتاب کے اردو ترجیحے پر جو ترجیحے کی تمام ضروریات کو محفوظ رکھتے ہوئے کیا گی ہے، یہتر، وہ کام اگار دوسرے واقع کرنی ایسا شخص جس کی مادری زبان انگریزی ہو اور اپنی مادری زبان پر عبور ہو نظر ثانی کرے۔ ایشیاء ہی کے ایک ملک جاپان کے ادب کا جائزہ لینے سے ترجیحے کی اہمیت اور فوادیت کا بھرپور طور پر اندازہ ہو گا۔ جاپان کے ادب کو عالمی ادب کا درجہ حاصل ہے۔ اس ملک کے ادب کو جو بلندی اور غنیمت حاصل ہوئی ہے اس کے کئی وجہ ہیں مگر جاپانی ادب کو ایک خاص سطح سے ادپر لے جانے والا سب سے اہم سبب غیر ملکی کتابوں کا جاپانی زبان میں ترجمہ ہے، ان ترجمے نے جاپانی زبان کی تخلیقات یا تحریروں کا مزاج بنایا ہے، ایک خاص منصوبے کے تحت جن پے شمار کتابوں کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے اس کی مثال پیش کرنا ممکن نہیں، جاپانی عوام کو پڑھنے سے جو لگا دا اور دلچسپی ہے اور دہاں پر غیر ملکی کتابوں کا جس دیس پہنچنے پر ترجیح ہوتا ہے اس کے پیش نظر

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں کہیں تو اتنی کتابیں پڑھی جاتی ہیں اور نہ کسی ملک میں اتنی بڑی تعداد میں غیر زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا ہے، یہ بات ہم بڑی سہولت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عالمی ادب کی تمام اہم کتابوں کا جایا فی زبان میں ترجمہ موجود ہے۔

دوسرا طرف ہمارے ملک کی صورت حال یہ ہے کہ انگریزوں کے

ٹوپی دوسری حکومت کی وجہ سے ہمارے اپنے قلم میں برطانوی ادبیات سے ہم آہنگ کرنے کا رحمان پیدا ہوا، ہمارے ملک کے جدید ادب کی آہیاری بڑی حد تک برطانوی سرشناسوں سے ہوتی ہے۔ اور جہاں تک غیر برطانوی ادب کے بارے میں ہماری تھوڑی بہت معلومات ہیں وہ انگریزی ترجموں کے دستے سے ہے، یہ صورت کچھ اُرد کی ہی نہیں بلکہ ہندی، بنگالی، گجراتی، تلنجی، مرہٹی، تامیل، ملیالم اور دوسری سب ہی علاقائی زبانوں کی یہی کیفیت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارا ادب جہاں تک کسی رہنمائی سے مطابقت پیدا کرنے کا سوال ہے بڑی حد تک، یک رخصہ ہو گیا ہے جب کہ دنیا کی تقریباً تمام اعلیٰ تخلیقات کا جایا فی زبان میں ترجمہ ہونے کی وجہ سے جایا فی ادب عالمی ادب کے دھارے سے مل گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سے تعلیم یا فہرستہ ہندوستانیوں نے انگریزی زبان میں ایسی دستگاہ حاصل کی ہے کہ ان کے ہم عصر جایا فی کبھی ایسی ماہرا نہ قدرت کا تصور بھی شائد نہ کر سکیں، ایک لحاظ سے یہ اچھی بات ہے کہ ہم غیر ملکی ادب کو راست طور پر جذب کریں، پہنچ اس کے کہ جایا نہیں کی طرح بالواسطہ ایسا کیا جائے لیکن ہندوستانی انگریزی ادب اس وقت تک نہیں پڑھ سکتے، جب تک کہ وہ ایک خاص عمر تک نہ پہنچ جائیں۔ حالانکہ اس عمر تک جایا فی عالمی ادب سے ایسی یگانگت اور واقعیت حاصل کر لیتے ہیں جیسی انہیں اپنے ادب سے ہوتی ہے۔

اس صورت حال کی وجہ سے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کے تعلق سے ہم ایک نصوبہ بند پر گرام پر عمل کیں یا پر گرام لیتا ہو جو با مقصدی، تعمیری اور وقت کے تقاضوں کی تکمیل کرنے والا ہو، تمام ممکنہ ذرائع اور وسائل کو منظم طور پر کیجا کر کے مربوط اور ہم آہنگ طریقہ پر کام کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلے میں چند سوداہنڈ بجا دین مرتب کر کے ان پر عمل کیا جاسکتا ہے، شلاہنڈستان میں ترجمہنگ کو باعزم مقام ملنا چاہیے ادبی انجمنوں کی جانب سے نہ صرف تخلیقی کارناموں کو بلکہ اچھے ترجموں کو بھی العلامات دینے جانے چاہئے۔ ہماری ریاستی حکومت، ترجموں کا کام کردا ہے لیکن یہ ترجمے ایک بندوستانی زبان سے دیگر بندوستانی زبانوں کی حد تک ہی محدود ہیں۔ اس کی بہر حال ایک قوم اور ایک ملک کے تصور کو خام کرنے کے لیے بڑی ضرورت ہے۔ لیکن قومی یا جنتی کا کام دراصل قومی ترقی کی بنیاد پر ہونا چاہیے کیونکہ ادب کی ترقی ملک کی ترقی کا ایک اہم جزد ہے۔

ہمارے یہاں چونکہ اسکو لوں اور یونیورسٹیوں ہی میں باقاعدہ مرطاب العکاء انتظام ہوتا ہے۔ اس لیے ان تعلیمی اداروں میں دوسری زبانوں سے متعلق مشعبوں کی تنظیم کو تعلیم، تدریس، تحقیق اور اشتافتی کاموں پر زیادہ سے زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ترجموں اور ترجمے کے فن کو ثانوی تعلیم کی سطح سے لے کر اعلیٰ جامعاتی سطح تک نصاب مرطاب العکاء در تحقیق میں اہم موضوع کی حیثیت دی جانی چاہیے۔

سیاسی اور سفارتی سطبوں پر بھی ترجمہ کے کام کو ترقی دینے کے موافق آج کی دنیا میں بہت کچھ حاصل ہیں، کسی بھی ملک میں غیر ملکی سفاقی دفاتر اس ملک کی زبانوں میں اپنے ملک کے ادب اور کتابوں کے ترجمے کرتا ہے، ہر ترقی یافہ ملک میں بیرونی زبانوں میں اپنے ملک کی کتابوں کے ترجمے اور اپنے ملک کی زبانوں میں بیرونی

ادب کی منتقلی کے کام و سینے عظیم پیمانے پر جاری ہیں، یہاں یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ ترجیح سے صرف مفید اور سودمند کام ہی نہیں لیے جاتے۔ یہ فن خطرناک اور تباہ کن بھی ہے، ترجیح سے سیاسی استھان، پر دیکنڈہ اور سرد جنگ کا ایک موثر ہتھیار بن چکے ہیں اور غیر صحیت منداور منفی اثرات کے حامل بن کر رہ گئے ہیں۔ اس خطرناک رجحان کی سختی سے مذمت کی جانبی چاہیے۔ ترجیحوں کا مقصد بنیادی طور پر علوم و فنون کی ترقی ایک دوسرے کے ادبی و تہذیبی ورثتہ سے واقفیت اور بین الاقوامی امن دوستی اور بھائی چارہ کو فردعغ دینا ہی ہزما چاہیے۔

اقبال اور صور و طبیعت

اقبال ہندوستان کے ان چند شاعر میں سے ہیں جنہیں ہرگز یہ
شهرت حاصل ہوئی۔ اقبال کا مقام اردو شاعری بھی میں عظیم نہیں ہے بلکہ ہر عصر
دنیا کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت ان کی
شاعری کی عظیم خصوصیات کی وجہ سے ہے ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیات
یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو ایک عظیم فصب لمحیں، فلسفہ حیات اور پیام کی
اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ ان کا مقصد نوع انسانی کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام تک
پہنچانا تھا وہ چاہتے تھے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ کر کے فنِ نسلیں اپنی اہمیت
کو بھیں اور انسان میں یہ خلاہش پیدا ہو کر وہ معمولی انسان بنے رہے کے بجائے
عظیم انسان بنیں۔ پھر وہ یہ چاہتے تھے کہ ایسے عظیم انسان دنیا میں ایک ایسا
انقلاب لا میں جس سے ہر شخص میں عظمت اور بلندی تک پہنچنے کا شوق پیدا ہو۔
حکومت اور محل اقبال کے فلسفہ اور پیام کی بنیاد ہے انہوں نے اپنی
شاعری میں فردِ جماعت اور زندگی کے اہم اور بنیادی سائل پر حکیمانہ اظہار

خیال کیا ہے۔ اقبال اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے انسان کو بہت اونچا در بلند مرتبہ عطا کیا۔ وہ احترام آدمی کو اصل تہذیب سمجھتے ہیں اور مقام آدمی سے سب کو باخبر اور آگاہ کرتے ہیں

آدمیت احترام آدمی باخبر شواز مفت ام آدمی

اقبال نے مشرق اور مغرب کے علم کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہی جو تھی کہ ان کی فکر گہری اور فلسفیات ان کا تخلی بلند اور جذبہ طاقت و رہتا۔ اقبال نے اپنے پیام کی اشاعت کے لیے تقریباً (۲۰) سال تک شاعری کی۔ اردو اور فارسی میں ان کی شاعری کے (۱۰) مجموعے شائع ہوئے۔ اپنی تمام شاعری میں اقبال کہیں بھی اپنے مقصد سے غافل نظر نہیں آتے۔ اقبال نے جب شاعری کا آغاز کیا اس وقت بھی اردو شاعری کا مقام میر اور غالب کی عظمت اور دوسرے اسمائیڈ کے شعری سرمایہ اور حاملی اور اکبر کے نئے تجربوں کی بدو کافی اونچا اور بلند تھا۔ لیکن اقبال نے اپنی شاعری سے اردو شاعری کو ہمگیری و سمجھتے اور نئی بلندیاں عطا کیں۔

اس مضمون میں اقبال کی ایسی شاعری پیش نظر ہے جو دن اور اس کے مسائل سے شاعر کی محبت اور دل چسپی کو ظاہر کرتی ہے۔ اقبال نے حب الوطنی کے پیسے ترانے لگائے ہیں جو میٹھے دل کش اور حیثیں ہونے کے ساتھ ہی ساتھ تاثیر میں آپ اپنی مثال ہیں۔ اقبال نے ان نغمہ سے اپنے ہم وطنوں کے دلیل میں حب الوطنی کے جذبہ کو طاقت ورہنانے کی کوشش کی۔

سارہ بھی جہاں سے اچھا ہندستان ہمارا
ہم ملبیں ہیں اسکے دلکشیاں ہمارا

اقبال کا یہ تراثہ ہندوستان کے قومی تراویں میں منفرد مقام رکھتا ہے اور آج بھی ملک کی فضاؤں میں گونجا رہتا ہے۔ اقبال کی نظمیں ہے، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیاشوالہ، تصویر درد مازام اور ناٹک جذبہ حب الوطنی سے بہری ہیں اور دردمند دل کی آواز ہیں۔ ان نظموں میں وطن سے پسخی اور گہری محبت کے انہمار کے ساتھ ہی ساختہ وطن کی زیوبن حالی پر نوحہ خوابی بھی ہے وہ اپنے اہل وطن کو ایک دوسرے سے محبت کرنے اور غلامی کا جواہار چیننکے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ اقبال کی اُردو شاعری کا پہلا مجموعہ "بانگ" وطن سے محبت کی شاعری کا ایک خوب صورت مرقع ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اقبال نے چند سال تک ہی حب الوطنی کے لئے گائے اور وطن سے محبت کا جذبہ صرف "بانگ درا" ہی میں نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کے ہاں یہ جذبہ آخر تک ملتا ہے۔ ضربِ کلیم (۱۹۳۶ء) اور جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) کی شاعری اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے۔

اقبال ضربِ کلیم کی ایک نظم "شاعع امید" میں ایک شوخ کرن کے ذریعہ نہ صرف مشرق بلکہ ارض ہند سے اپنی دلی والیستگی، محبت اور دردمندی کا انہمار ان اشعار میں کرتے ہیں۔ شوخ کرن کہتی ہے۔

چھوڑ دل گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گران خواب

خادر کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز

اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشم مرد پر دین ہے اسی خاک سے روشن
 یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درناب
 اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص مسانی
 جن کے لیے بھر پاآشوب ہے پا یاب
 جس سانکے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
 محفل کا دہی ساز ہے بیگانہ مصراپ
 بست نہاد کے دروازے پر ہوتا ہے بہن
 نہستدیر کو روتا ہے مسلمان تہ محراب
 مشرق سے ہو بیزارہ معززب سے حذر کر
 نظرت کا اشارہ ہے کہ ہرشب کو سحر کر
 اور دشمنی میں ایسے اشعار کی مثال مشکل سے ملے گی جن میں شاعر
 وطن پرستی کے جذبات سے اس درجہ سرشار ہوا اور اس کی درد مندی کا یہ عالم ہو۔
 ہادیہ نامہ میں جوا قبائل کی مشاعری کے آفی دوسری کی تائندگی کتاب ہے
 اقبال سے اپنالاک کے دو مالو میں بھی اپنے دھن کو نہیں پھر لئے، دھن کی محبت
 نہ ساختہ، بھی دھن کو آزاد دیکھنے کی ترقی پ بھی ملتی ہے۔ دھن کی زبوں حالی پر
 اس کا ہر بندہ نہ سمجھے۔ یہ اسیراقبال مولا نامہ م کی ہماری میں کرتے ہیں جہاں وہ
 بہند رضاۓ کی عظیم شخصیتوں مہاتما پدھر اور بھرتری ہری سے ملتے ہیں یہ دستائے
 کیا ہے یہم شخصیتوں دنیا اور زندگی کے ہمارے میں اہم نکتہ اقبال کے گوش گندر
 کرتے ہیں اس وجہ پر اقبال بھرتری ہری سے اپنے ہم و مطون... کی حالت
 اور سبھی چیزیں کے پار سے ہی منتخار کرتے ہیں تو بھرتری ہری اس کے اسباب و

پر دشمنی ڈالنے تھے ہیں۔

اسی سیر کے دوران ملک زحل پر اقبال کو ان دو خدا را پیغام بھن کی روشنی
نظر آتی ہیں جنھوں نے ملک دھلت سے پہلے وفاتی کی احمد ملک میں علامی کاشی سعیج بیوا
دوہیں۔

جھفراز بیگان و صادق از دکن
ننگ آدم ننگ دیں، ننگ دھن
ان کی ارداح کو سخت اذیت دعذاب میں مبتلا دکھانے کے بعد
ردع ہندستان کو آسمان سے نمردار ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔
آسمان شق گشت دھرے پاک زاد

پر دہ لاف چہ سرہ خود بر کشاد
در جبیش نار و نور لا یزال

در د چشم او سرور لا یزال
حلہ در بر شیک تراز سحاب

تار و پودش از رگ برگ گلاب
با چنیں خربی نصیبیش طوق دیند

بر لب ادنالہ ہائے در مند

گفت رو می ردع ہند است این نگر
از غن نش سوزما اندر جگ

اس منظر میں اقبال نے ہندستان کی بخوب صورت اور نادر تصور
پیش کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں اپنے دھن سے انہیں بھر پور محبت اور

دالیستگی ہے وطن کی غلامی کے خیال سے وہ بے حد دکھی اور رنجیدہ بھی ہیں۔ روح ہندوستان اقبال سے نالہ و فریاد کرتی ہے کہ وہ آزادی کی روشنی سے محروم ہے اور غلامی کی تاریکی اس کا مقدر ہے۔ میر جعفر جیسے غازان وطن ابھی ملک میں موجود ہیں ایسی ملعون روحوں سے روح ہندوستان پناہ مانگتی ہے۔

وطن سے غداری کرنے پر جو ذلت اور رسوانی ہوتی ہے اور غدار کا جو عبرت ناک اور شرم ناک انجمام ہوتا ہے اس کا نقشہ اقبال بڑے موثر انداز میں کھینچتے ہیں۔ غداران وطن میر جعفر لاہور صادق کی روحوں کو کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا۔ انھیں کوئی قبول کرنے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ جہنم کی آگ نے بھی یہ کہہ کر ان روحوں کو تبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ان سے خس و خاشاک بہتر ہے اور جہنم کی آگ ان ملعون روحوں سے زیادہ پاک ہے۔ جاوید نامہ میں بیان کی ہوئی یہ باتیں کیا یہ ثابت نہیں کرتیں کہ اقبال سچے وطن پرست ہی نہیں تھے بلکہ وطن کے غداروں کو بھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔

اقبال کی شاعری میں آزادی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آزادی کے لیے احساس اور جنپی کی شدت، تڑپ اور یہ قراری ان کے اشعار میں جگہ جگہ ملتی ہے وہ غلامی کی زندگی کو برائیوں کی جگہ سمجھتے ہیں اور اسے ہر طرح سے ہدف ملتا بناتے ہیں انہیں اپنے ہم وطنوں سے غلامی بنے رہنے پر شکایت ہے۔ ضربِ کلیم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ہے

لیکن مجھے پیدا کیا اس دلیں میں تو نے
جس دلیں کے پندے ہیں غلامی پر فائد

پورپ کی غلامی پر صفائحہ مند ہو تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے پورپ سے نہیں ہے،

اس بحث میں جوابات و فناحت طلب رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وطن سے
محبت اور آزادی وطن کے لیے شدید خواہش، امنگ، اور سچی تربیت کے باوجود طنیت
اور قومیت کے بارے میں ان کے تصورات میں جو تبدیلیاں آئیں وہ کیا تھیں، کسی
نوعیت کی تھیں۔ اقبال کی شاعری کے گھر سے مطالعہ کی روشنی میں ان تبدیلیوں کو
ذہنی ارتقا رکانیتی سمجھنا چاہیے۔ یہ تبدیلی جذبہ کی تبدیلی نہیں بلکہ معنی و مفہوم کی
دستتھی۔ انھوں نے وطن کی محبت کو ترک نہیں کیا۔ وطن پرستی سے ایک دنیا
اور آفاقت کی طرف ان کی نکرنے جست لگائی۔ اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے ہمارے
ذمک میں یہ بات رہنی چاہیے کہ اقبال کی معاصر دنیا میں قومیت اور وطنیت کے تصوری
میں نہیں معنی و مفہوم میں نئی وسعتیں ابھر رہی تھیں۔ وہ دن گزر چکے تھے جب قومی درجہ
اور انسانوں میں اتحاد کے لیے وطن کو ایک بنیاد سمجھا جانا تھا۔ اقبال کے عہد میں اس
تصور اور خیال میں تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ عالم گیر انسانیت کا تصور عام ہو رہا تھا۔
مفکرین نے خیال کی یہ جہتی اور مخصوص نظام حیات پر القابن کو سماجی اتحاد کی بنیاد
بنتا یا۔ مارکس نے پولیسی امریت کے بعد غیر طبقاتی اور بغیر ملکت کے سماج کا تصور
پیش کیا اور اسی تصور کو آگے برداشتے ہوئے لینن نے بین الاقوامی اشتراک کا نظریہ
پیش کیا۔ گاندھی جی بھی ملکت کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ ٹیکور قومیت کے تنگ
دائرہ کے خلاف تھے اور بین الاقوامی قومیت میں لقین رکھتے تھے۔ ٹیکور نے
۱۹۲۰ء میں جب وہ امریکہ کے ہونے تھے اپنے لکھر میں کہا تھا:

”مجھے ہندوستان سے محبت ہے میری مراد ہندوستان سے اس کے

درود لیا رہیں بلکہ اس کا نصیب العین ہے۔ اس خیال کے
تحت اگر لوگ مجھے محب وطن نہ گردانیں نہ سہی لیکن میں دنیا
کے ہر گو شہر میں ایسے ہم طنوں کی تلاش میں رہوں گا۔

اقبال کے ہاں قومیت کا جو تصور ہے وہ ایک *Almaah* وہ ہے اپنے اس
تصویر کی تشكیل میں اقبال قرآن سے استفادہ کرتے ہیں اور خدا انسان اور حیات و کائنات
کی درحدت کو جب اپنے تصویر زمان دمکان کے امینہ میں پیش کرتے ہیں تو اس غلطیم تصور
میں کسی قسم کی نسلی جغرافیائی اور قومی تقسیم کا امکان باتی نہیں رہتا۔ اس تصور تو حید
کو وہ انسان کے لیے تکمیل ذات کی حقیقتی دنیا تصور کرتے ہیں اور اسے بنی نوع انسان
کا وطن قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر زورا اور ان کے تحقیقی کارنالے

اُندھے کے معمار اور اُندھو تحریک کے رہنمائی حیثیت سے ساری دنیا ڈاکٹر زورا سے اچھی طرح واقف ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ جدید حیدر آباد کی تعمیر و تشكیل اور ملک کے اس خطہ میں علوم و فنون کی ترقی ادبی علمی تحقیقی اور اشاعتی سرگرمیوں کے فروع غرض یہ کہ ایک منفرد اور مشابی ملی جسی تہذیب کو پیدا نہ کرنا چاہئے میں جن لوگوں نے اہم حصہ لیا۔ ان میں ڈاکٹر زورا کی شخصیت بڑی نمایاں ہے۔ یوں تو ڈاکٹر زورا کی خدمات علمی ادبی اور تہذیبی تسبیح میں بظاہر مرکوز نظر آتی ہیں لیکن اُس کے اثرات اور نتائج بڑے دُور ریس اور بہرہ گیر ثابت ہوئے اور مستقبل میں بھی ان کی خدمات کو اور واسطع اہمیت حاصل ہوگی اور اسی کو بنیاد بنا کر ادب کے قافلے آگے بڑھیں گے۔

ڈاکٹر زورا کی شخصیت کی اہم اور بنیادی خصوصیت محنت اور عزم و حوصلہ ہیں۔ ان ہی بنیادی خصوصیات نے مجی الدین قادری زور کو ڈاکٹر زور بنایا، کامیابیوں سے ہم کنار کیا اور ایسے کارناموں کا حوصلہ دیا جن پر حیرانی ہوتی ہے۔

کوئی فرد ہو کر معاشرہ یا کوئی قوم ہو اس کی ترقی، خوش حالی اور روشن مستقبل کا دار دلار پر خلوص اور مسلسل سعی و کاوش پر ہو اکرتا ہے اس کے لیے سخت محنت کا عادی ہونا پڑتا ہے جس تو عمل پر ایمان رکھنا پڑتا ہے اس کی ایک اچھی مثال ڈاکٹر زور کی زندگی ہے ممکن ہے کہ ایسا ہر یہ بات سمجھی ورداستی معلوم ہو لیکن یہی وہ حقیقت اور راز ہے جس کے ذریعہ افراد ہی نہیں معاشرے اور تہذیب میں بھی یا میں عدرج پر پہنچنے کا اعزاز حاصل کرتی ہیں۔

بے محنت پہنچنے کا اعزاز حاصل کرنا کوئی جو ہر روزن شر تدشیز سے ہے خانہ فریاد

ڈاکٹر زور کی متعدد تصانیف، ادارہ ادبیات اردو اور ایوان اردو کی عمار کو دیکھ کر ان کی اہمیت اور ڈاکٹر زور کی محنت کا اندازہ نہ کرنا اور بات ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ انھیں اپنے کاموں کی انجام دہی میں بڑے ناسازگار اور نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ بسا اوقات محنت جدوجہد کے باوجود انھیں خاطر خواہ امداد اور تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مالیوں اور نماہیوں میں بھی۔ حوصلہ شکن ماحول اور حالات میں بھی انھوں نے اپنی جدوجہد جاری کھی۔ یہ ان کا حوصلہ اور عزم ہی تھا جس نے انھیں کامیابیوں کی منزل تک پہنچایا۔ ان کے تمام کام اور کارنے سے محنت، عزم اور حوصلہ کا درس دیتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت بلاشبہ غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی اپنے دوست احباب، ساتھیوں، شاگردوں حتیٰ کہ سرسری طور پر ملنے جلنے والوں کو بھی پہنچنے دعوت عمل دیتے اور بے عمل اور کامیاب لوگوں سے ناراض رہتے اور انھیں محنت بُدلت سُراتے۔

ڈاکٹر زور کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے حیدر آباد میں نئے لکھنے والوں کا ایک بڑا گروہ بلکہ کاروان تیار کیا اور سمجھتے خود سی سرپراہ اور میر کاروان کی حیثیت سے آگے آگے بڑھ دے اپنے شاگردوں کو لکھنے کی ہمیشہ ترغیب دیتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ان کے جن شاگردوں اور تربیت یافتہ ادیبوں نے ان کی شخصیت اور کارناموں کو خراج تحسین ادا کیا ان مصنایمن میں ہر ایک نے ڈاکٹر زور کے مشققانہ رویہ اور حوصلہ افزائی کا ضرور ذکر کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر زور کی انتہا اور مخلصانہ کوششیوں کی وجہ سے حیدر آباد سے اجھنے والے ادیبوں میں ذوق عمل اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ ادیب اور شاعر جو اچھی اور انگلی سلسلہ حیثیتوں کے مالک تھے بہت جلد اپنے علمی اور ادبی کاموں کے باعث سارے ملک میں جانے پہنچانے جانے لگے اور انھیں ناموری اور شہرت حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔

ڈاکٹر زور نے بسیوں کتابیں تصنیف کیں اور سینکڑوں مصنایمن لکھنے اور کثیر تعداد میں ادیبوں اور شاعروں اور علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی تربیت کی اور ان سے لکھوایا۔ ڈاکٹر صاحب کا اہم اور پسندیدہ موصوع جس پر خود انھوں نے کام کیا اور کروایا دکنی زبان اور لدبی لہوار دکنی تہذیب تھا۔ دکنی زبان و ادب اور دکنی تہذیب پر کام کرنے کے لیے ڈاکٹر زور نے جو بڑی اور باضنا بظہر تحریک چلائی۔ اس کی وجہ دکنی زبان و ادب اور دکنی تہذیب سے ڈاکٹر زور کی محبت تھی۔ سرزی میں دکن کے ذرہ ذرہ سے انھیں عشق تھا۔ لیکن اس کے علاوہ یہ تحریک ڈاکٹر زور کی ایک شعوری کوشش بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے بھی اس کے بڑھ کر یہ تحریک ان مخصوص حالات کے خلاف ایک رد عمل کی حیثیت رکھتی تھی۔ جن میں ڈاکٹر زور کی نسل پر وان چڑھ رہی تھی۔ یوں تو اس زمانے میں ان حالات کے علا

پھر دیکھنے کے لیے یہاں ذہنی رد عمل موجود تھا۔ لیکن ڈاکٹر زورنے اس رد عمل سے ایک باضابطہ تحریک کی شکل دی۔

شانہ شام میں اوزنگ زیب نے گولکنڈہ فتح کیا اور قطب شاہی سلطنت کو مغلیہ سلطنت میں ضم کر لیا گیا اسے دکنی زبان دارب اور دکنی تہذیب کے زوال کا، نقطہ آغاز سمجھنا چاہیے۔ قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد اوزنگ آباد مغلوں کے صوبہ دکن کا دارالخلافہ رہا اور جب تقریباً سو سو برس بعد شانہ شام کے لگ بھگ نیہ دارالخلافہ اوزنگ آباد سے حیدر کباد منتقل ہوا۔ آصف جاہی سلطنت کی سائز لگھٹ گئی تھی اور جنوب کے تمام مغل امرا ریہاں سمٹ کر لگئے تھے۔ ستمبر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ایل ٹکھنہ اور دلی والوں کی آمد کا سلسہ نشویں ہو گیا۔ خاص کر سالا رجمنگ اول کی ایک پرشامی ہند کے پڑھے لکھے اور باصلاحت افزاد کی ایک بڑی تعداد حیدر آباد آئی۔ حیدر آباد کا یہ دور مغل برطانوی دور کے نام سے موسم کیا جاتا ہے۔ مغلوں نے دکن میں فارسی زبان رائج کی جسے آصف جاہی دور میں بھی جاری رکھا گیا۔ دکنی زبان کی سر پستی ختم ہو چکی تھی اور اس کا ارتقاء رُک گیا تھا۔ لیکن یہی زبان شمالی ہند میں ارتقاء پذیر ہو گرا درد کھلانی۔

کے لگ بھگ جب اردو کو فارسی کی بجائے دفتری زبان قرار دیا گیا تو دفتری نظر و نسق بڑی حد تک نووار دلی و لکھنؤ کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔ ان سیاسی حالات اور مبدلیوں نے مقامی لوگوں میں جنہیں اب تک بھی ملکی باشندے کہا جاتا ہے احساس کمرتی کا جذبہ پیدا کیا اور ان پسناہی کا پیش لکھا گیا۔ لیکن جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اس صورت حال کو بدلتا ہے۔ جامعہ کے قبیل

اور ہونہا رسپورٹر نے احساسِ لکھتی کو ختم کرنے اور خود اعتمادی کے جذبے کو بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی اس تحریک اور مہم کے امام ڈاکٹر زور تھے۔ دکنی زبان اور ادب کی بازیافت کے ذریعہ وہ نہ صرف یہ کہ اردو زبان اور ادب کے آغاز و انتشار کے سلسلہ کی گمراہی کر دیں گے بلکہ یہ بھی دکھانا چاہئے تھے کہ اردو کے آغاز و انتشار میں دکنیوں کا کتنا بڑا اور اہم روڈ ہے ساتھی ساتھ اپنے دکن پر لگائے گئے تاہمی کے پیغام کو نکالنے اور انھیں اپنے اور بآکمال ثابت کرنے کے لیے خود انہوں نے کتنی بھی کتابیں تصنیف کر دیں اور انہی پورے کو تربیت دے کیا اس سے بھی کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف کر دیں اور بکثرت مضامین لکھوائے۔

ڈاکٹر زور اش اپردازہ ترقیدنگار، شاعر، افسانہ نگار اور ماہر سانیا۔

ہونے کے علاوہ ادبی و تہذیبی مورخ اور محقق بھی تھے۔ ایک مختصر مضمون میں ان کے تمام ادبی کارناموں کا جائزہ لینا اور علیحدہ علیحدہ میدان میں ان کے مقام کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے اسی لیے اس مضمون کو ان کے تحقیقی کارناموں کے جائزہ کی صورت محدود رکھا گیا ہے۔ "کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" "میر محمد مومن" "اردو شہ پارے" "داستانِ ادب حیدر آباد" "دکنی ادب کی تاریخ" اور تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو" ڈاکٹر زور کے اہم تحقیقی کارنالے میں ہیں۔ ان میں سے چند تصنیف کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کی تحقیق کے پاسے میں چند باتیں عرض کروں گا۔

"کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر زور کا

ہے بڑا کارنامہ ہے۔ اس ضخیم دلوان کی ترتیب برسوں کی محنت اور عرق ریزی کے بعد عملکر ہو سکتے۔ اس میں ڈاکٹر زور نے بولفضل اور بسو طبقہ مقدمہ سیر قلم کیا ہے وہ محمد قلی قطب شاہ کی سوانح اور اس کی شاعری کی خصوصیات کا حاضر کرتا ہے۔ محمد قلی کی سوانح اور شاعری کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی غرض سے دکنی تہذیب کے پس منظر کو صبی ابھارنے کی انہوں نے پوری پوری کوشش کی۔ یہ مقدمہ ڈاکٹر زور کے بلند پایہ سوانح نگار اور ادبی مورخ ہونے کا بلین ثبوت ہے۔

اس تحقیقی کارنامہ کے منظر عام پر آنے کی وجہ سے اردو زبان اور ادب کے بارے میں جو بعض غلط مفروضات اور نظریات عام تھے یکسر رکرداریئے گئے اور محمد قلی کی شاعری نے اردو شاعری پر عائد کیے جانے والے اکثر اعتراض اور الزامات کا جواب بھی دے دیا۔ محمد قلی کی شاعری کو اردو دنیا سے روشناس کر داکے ڈاکٹر زور نے تاریخ اردو ادب کو ماں میں نئی دعتوں سے ہمکنار کیا۔ اور نئی خطہت اور سہہ گیری بخشی۔

ڈاکٹر زور نے اپنے مقدمہ میں گولکنڈہ کی تہذیب اور تمدن کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، رداداری، قومی یک جہتی اور پاہمی بیگانگت کی ایک روشن مثال ہے۔ گولکنڈہ کی یہ تہذیب ملک کے دیگر حصوں کی تہذیب کے مقابلے میں زیادہ "ہندوستانی" زیادہ تحقیقی اور تصنیع اور تکلف سے مبررا تھی۔ ڈاکٹر زور اگر کلیات محمد قلی قطب شاہ کو مرتب کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہ بھی کرتے تب بھی اس تحقیقی کارنامہ کی بنا پان کا نام اردو دنیا میں ہمکیشہ ہمکیشہ زندہ رہتا۔

"میر محمد مومن" تحقیق ہی کے باب میں ڈاکٹر زور کی ایک اہم تالیف ہے جو قطب شاہی دور کی ایک مہماں سیاست اور سماجی شخصیت کی حیات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ اسی کتاب میں ڈاکٹر زور نے تمام اہم اور ضروری مأخذوں سے استفادہ کیا ہے جس میں نایاب دکیاب مختصر طبیعات مطبوعات دستاویزی شہادتیں اور آثار قدیمہ کے مأخذ شامل ہیں۔ میر محمد مومن کے پسمندگان کے یہاں محفوظ کاغذات اور مواد کا بھی ڈاکٹر زور نے مطالعہ کیا۔ شہر کے اطراف داکناف اور جہاں جہاں سے بھی مواد فراہم ہو سکتا تھا پہنچ کر بڑی ہی تگ دود، دردھوب پ اور حچان بین کے ذریعہ مواد حاصل کیا۔ میر محمد مومن کی تعمیر کردا ہوئی ہوئی عمارتیں مسجدیں، تالاب اور ریہات دیکھے۔ اس کے علاوہ روایات اور حصوں کے بیان سے کتاب میں وہ فضاء پیدا کرنے کی کوشش کی جو تہذیبی تاریخ کو ترتیب دینے کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے۔ معاصر اور قدیم مأخذوں سے ضروری معلومات اور مواد فراہم نہ ہونے کی صورت میں ہی ڈاکٹر زور نے بعد کے مأخذوں سے استفادہ کیا۔

اس کتاب میں میر محمد مومن کے پسمندگان کے بارے میں تفصیلی معلومات دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ میر محمد مومن کے آبادا جداد، ان کے خاندانی حالات اور ان کے دطن ایران میں ان کے ابتدائی حالات زندگی پر بحث تفصیل سے لکھا جانا چاہیے تھا۔ لیکن یوں لکھتا ہے کہ ڈاکٹر زور کو لکنڈے کی سیاسی اور سماجی زندگی میں میر محمد مومن کے ردیل اور contribution کو بڑی دلخواحت کے ساتھ بیان کرنا چاہئے تھے۔

سوائیں نگاری کے فن اور چینی اصولوں کی روشنی میں اگر تم اس

کتاب کو بھاپنا چاہیں تو قدر سے مایوسی ہو گی کیونکہ میر محمد مولانا کی زندگی اور شخصیت کے بعض گوشے تاریخی میں ہی رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کارناموں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات فراہم نہیں ہو سکیں لیکن یہ کتاب کی کوئی خامی اور نقص نہیں ہے۔ فصل زبانی کے باعث وہ تمام مواد فراہم نہیں تھا جو سوانح اور کارناموں پر مفصل کتاب لکھنے کے لیے ضروری تھا۔ یہ کتاب بلاشبہ گولکنڈہ اور اس کی تہذیب بھی میں مدد دیتی ہے اور یہی ہولف کا مقصد تھا۔

تذکرہ اردو مخطوطات ادارہ ادبیات اردو جو پانچ جلدیں پرستیل ہے ڈاکٹر زور کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں اردو مخطوطات کا تذکرہ یا تو فتحی فہرست کسی ادارے سے اردا بئری میں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ شکل میں موجود نہیں ہے۔ ادارہ ادبیات اردو اور ادارہ میں لا نیبری کے قیام کے بعد ڈاکٹر زور نے نادر اور اہم مخطوطات اکھڑا کرنے کی چہرہ شروع کی اور جب ادارہ کی لا نیبری میں قلمی نسخوں کی تعداد ۵۰۰ سے تجاوز کر گئی تو ڈاکٹر زور کو ان نسخوں کا تذکرہ مرتب کروانے کا خیال پیدا ہوا۔ ڈاکٹر زور اپنی صرکاری و دینگر علمی و ادبی مصروفیتوں کے باعث یہ کام اپنے لاحباب جناب غلام رسول اور پروفیسر سروری سے کر دانا چاہتے تھے جنہیں وہ اس کام کے لیے موزدل اشخاص تصور کرتے تھے۔ لیکن جب یہ حضرات بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس پر اجکٹ کے لیے وقت نہ دے سکے تو ڈاکٹر زور نے خود اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کام کے لیے ڈاکٹر زور ہی نہایت موزدل شخص تھے۔ طالب علمی ہی کے دور سے وہ اپنا پیش روقت لا نیبری میں قدیم مخطوطات کے مطالعہ میں گذارا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہیں قدیم دکنی مخطوطات کو پڑھنے میں بڑی صہارت حاصل ہو گئی تھی۔

جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہو کر ڈاکٹر زورپی ایچ ڈی کی درگی حاصل کرنے کے لیے یورپ گئے اور یورپ کے دوران قیام میں انھیں جتنے بھی قدیم اردو مخطوطات دستیاب ہو سکتے تھے ان سب کا غائر مرطاعہ کیا۔ قدیم مخطوطات کو پڑھنے کی مہارت مخطوطات کا وسیع مرطاعہ اور وسیع معلومات ہی کی وجہ سے ڈاکٹر زورا تشاشکل اور وقت طلب کام بہتر طور پر انجام دینے کے قابل ہو سکے۔

اگر کوئی مخطوطہ رشت خط میں ہو یا ناقص الاول یا ناقص الآخر ہو یا پھر اس کا سن کتابت یا سن تصنیف دستیاب نہ ہوتا ہو تو تذکرہ نویں کو گمراہ کر دیوں کو ملانے کے لیے انتہائی صبر آزمایا اور انتہائی دشوار گزار مراحل سے گزنا پڑتا ہے پہلے تو یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اندر وہی شہادتوں سے کام نکالا جائے اگر اندر وہی شہادتیں ناپید یا ناکافی ہوں تو دیگر ماخذوں اور مطبوعات کی مدد سے اس مخطوطے کے بارے میں چھان بین صرفہی ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے دیگر اداروں اور لا بئر ریوں کے تذکرہ دل کی مدد سے یا خود مرتب کو اپنی معلومات کی وثائقی میں بھی آگے برداشت پڑتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تذکرہ مخطوطات کی ترتیب کس قدر دشوار ہے اور اس کے لیے کتنی ریاضت اور جان سوزی درکار ہے اس اعتبار سے تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات بجائے خود ایک ایسا تحقیقی کارنٹ ہے جس کی بنیاد پر ڈاکٹر زور کا نام تحقیق کے میدان میں ہمیشہ اہمیت کا حامل رہ گا ڈاکٹر زور نے دکن کی ادبی تاریخ یا تہذیبی تاریخ کے بارے میں جو

کچھ بھی قلم بند کیا ہے وہ اصول تحقیق کے اعتبار سے ایک مخصوص الفاظ ادب کا حامل ہے بعض نزاعی مسائل کے قطع نظر ان کی تحقیق کی بنیاد عالم طور پر مضبوط کی جاسکتا ہے اسکی تحقیق سا فہد معہر اور اسٹ لال قوی ہیہ بات ہی نہیں ہونی چاہیے کہ ادبی و تہذیبی تاریخ کی نظر ہی تحریر

شہادتوں کو بھتی اہمیت حاصل ہے رسم و رواج زیانی روایتوں اور حکایتوں کو کچھ کم اہمیت حاصل نہیں۔ مسٹر لینٹن Mr. Lynton اور موہنی راجن کی کتاب The days of the beloved حوالہ ہی میں امریکی سے شائع ہوئی ہے جو نواب میر محبوب علی خاں اصفہن جاہ سادس کے دور کی تاریخ ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مأخذ تحریری سے زیادہ تقریری ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب میں لوگوں کی زبانی و تقریری شہادتوں کی بیان کی ہوئی ہاتھی کہ قصہ کہانیوں اور انواع ہوں کوتک اہمیت دی گئی ہے۔ اس خصوصیت کی بنا پر اس کتاب کے کافی جھپچھپے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مسٹر لینٹن اور موہنی راجن نے جور دیا ت قلمبند کی ہیں اس میں کچھ زیادہ تاخیر نہیں ہوئی تاہم یہ روایات بھی کوئی معاصر روایات نہیں۔ قطب شاہی دور کی روایات کو محفوظ کرنے کا کام بڑی محنت سے ڈاکٹر زورنے انجام دیا۔ انھوں نے معتبر اور مستند ماذدوں سے اخذ کردہ مواد کو اکٹھا کی ہوئی روایات سے چورنے اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور اس طرح انھوں نے تحقیق اور روایت کی آمیزش سے ایک ایسا تحقیقی ادب پیش کیا جس سے ایک محقق سے لے کر عام آدمی تک اپنی بھانت کے مطابق بہرہ اندر دز ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر زورنے اپنی تحقیق میں داستان کو داستان اور افسانہ کو افسانہ کہا ہے اور داستان اور افسانہ کو کبھی تحریری شہادت کا نام نہیں دیا۔ داستان ادب حیدر آباد کے دربار پرہیز میں دہ کہتے ہیں۔

اس کتاب کے مطلعہ کے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ پرکوئی بہرہ تاریخ یا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا جائز ہے جو زیادہ

مولف کے تاثرات پر مشتمل ہے اور جس میں پہلی بار اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے نہ صرف شاعر دل بلکہ ہر مومن نے کے نشر لگاروں کی نسبت بھی اندروری معلومات یک جا کر دی گئی ہیں۔ یہ جن دس ابواب پر مشتمل ہے ان میں سے ہر ایک اتنی وسعت اور اہمیت رکھتا ہے کہ اس پر علمیہ اور مدرسہ طکتب لکھی جا سکتی ہے۔ اگر مستقبل کے ادیب اس کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوں تو بھنا پایا ہے کہ یہ داستان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔“

دکنی تہذیب کی بازیافت کے لیے ڈاکٹر زورنے جو کچھ کوششیں کی ہیں ان پر اگر اعتراض کیا جائے کہ وہ مستند اور مستبرحق ہے میں ہیں ہیں تو اس اعتراض کو زیادہ ذریفی نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ ڈاکٹر زورنے جن روایتوں اور حکایتوں کو محفوظ کیا رہا تاریخی طور پر کتنی ہی غیر حقیقی کیوں نہ سمجھی جائیں۔ کیا یہ خود ایک تاریخی حقیقت نہیں کہ یہ داستانیں ایک خاص دکنی تہذیب کے خمیر سے ہیں ابھری ہیں اور صدیوں اس میں گشت کرنے رہی ہیں۔ ان دیرینہ داستانوں نے دکنی تہذیب کے ماحول سے اتنے عناصر اور ایسا نگ دروغی حاصل کیا کہ دکنی تہذیب کے ماحول میں انھیں بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ روایت کے مزاج اور اجزا اور کسی بغیر سیاسی تاریخ نویسی کے انداز میں ہر بات کا دستاویزی ثبوت ملب کر کے تہذیبی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ فنِ حقیقت کے اس رمز کو ڈاکٹر زورنے نے سمجھا تھا اور خوب سمجھا تھا۔ ڈاکٹر زورنے پر بعض تنقیدیں ان کے اسی انداز اور معیارِ تحقیق کی وجہ سے ہوئی ہیں لیکن ادبی اور تہذیبی بصیرت کی بالیگی کے ساتھ محسوس کیا جائے گا کہ جن امور کو موجب تنقید سمجھا گیا دراصل وہ لائق تحسین ہے۔ ڈاکٹر زورنے دکنی ادب کے ساتھ اس کا ماحول بھی پیش کیا۔ قطب شاہی دور کی

تہذیب اپنے محور اور جگہ سے ہٹ چکی تھی۔ اس کی جگہ مغل برطانوی تہذیب کا اثر نمایاں تھا۔ ڈاکٹر زورنے داستان سرائی، روایت، حکایت وغیرہ سے وہ ماخول ابھارا جس کی وجہ سے دکنی ادب کو سمجھنا آسان ہو گیا اور اس کی حقیقی قدر و منزالت کا تعین بھی ممکن ہو سکا۔

ڈاکٹر زور کے تحقیقی کاموں میں بعض غلطیوں اور کوتا ہیوں کی لشان دہی کی جاتی ہے اور اعتراف کیا جاتا ہے کہ ان کا یہ کام اعلیٰ معیار کا نہیں ہے یا ادھورا یہ اعتراف درحقیقت درست اور بجا نہیں ہے۔ تحقیق میں کوئی کام اور کوشش حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ پہلے یہی کام شروع کرنے والوں کا کام لاکھ کوششوں کے باوجود ادھورا رہ جاتا ہے یہونکہ تمام ماذان کی نظرؤں کے سامنے نہیں ہوتے۔ کتنے ہی گوشے ان کی نظرؤں سے پوشیدہ رہتے ہیں جو ماذد چھوٹ جاتے ہیں۔ ان سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل کے محقق تحقیقتوں کو آگے بڑھلتے ہیں کلیات محمد قلی قطب شاہ کو ڈاکٹر زور نے آج سے ۲۶ سال قبل ترتیب دیا تھا۔ اگر کوئی محقق آج دوبارہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زور کے کام میں کچھ عیب پاتا ہے تو اس میں حیرت اور تعجب کی بات نہیں ہے۔ دکنی ادب پر تحقیقی کام کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ اب ڈاکٹر زور کے کام کو آگے بڑھانا ممکن ہے۔ نئے ماذد اور نئی تحریری شہادتوں کی روشنی میں محمد قلی کے سوانحی حالات میں کچھ رد و بدل بھی ممکن ہے۔ ڈاکٹر زور جن گھر ہوں کو کھول نہیں سکتے تھے اور جن غیر مانوس الفاظ کے معنی و مفہوم کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے تھے ان میں سے اکثر دبیشور گرہیں کھل چکی ہیں۔ اور غیر مانوس الفاظ کے معنی و مفہوم بھی واضح ہوتے جائیں ہیں۔

ڈاکٹر زور بسیار نویں تھے وہ کسی ایک تصنیفی دنالیفی کام پر زیادہ وقت
بینے کے قابل نہیں تھے۔ وہ طویل مدت تک ایک تصنیف کی چھان پھٹک اور
س پر نظر ثانی کی بجائے کسی دوسرے علمی ادبی کام کے آغاز کو بہتر اور مناسب
مجھتھے تھے۔ یہ ڈاکٹر زور کا علمی روایہ تھا۔ ان کے خیال میں کوئی بھی علمی اور ادبی
ہم حرف اُخري کی حیثیت نہیں رکھتا۔ تحقیق طلب امور پر مoward کی فراہمی اور
دعا، یوں کی نشان دہی اور ان کی اصلاح مستقبل کے ادیب و محقق کا کام ہے
علمی روایہ اور ان کی بسیار نویسی نے ان کے تحقیق کے کام کے معیار کو کچھ نقصان
زور دے پہنچایا ہے تاہم اُردو ادب میں تحقیقی کام کا ایک بہت اہم درقابل قدر ذخیرہ
اصحًا ہو گیا۔

بعض ناقیدین نے مذکورہ بالا اعتراضات کی روشنی میں ڈاکٹر زور کے
تایقی کاموں کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر زور کے تحقیقی کارناموں
اہمیت مسلسلہ ہے اور ان کی قدر قیمت کم نہیں کی جاسکتی۔ اصل میں یہ اعتراضات
بصیری پر مبنی ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ
درمی دیر کے لیے تاریخ اُردو ادب اور اُردو ادب کے ماحول سے ڈاکٹر زور کی
شخصیت اور ان کے کارناموں کو یکسر بھلا دیا جائے اور اس کے بعد دیکھا جائے
لیا ڈاکٹر زور کے بغیر بھی اُردو زبان اور ادب آج جس مقام پر ہیں کیا وہیں ہو سکتے
ہے۔

اس اعتبار سے اگر ڈاکٹر زور کو اُردو زبان اور ادب کی دنیا میں تاریخ ساز
عہد ساز شخصیت کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہو گا۔ انھوں نے اس زبان اور
ادب کے ایک عہد کی بازیافت کی جس کی وجہ سے زبان ادب کی تاریخ کو از سر زکھنا

صردراہی ہو گیا۔ انھوں نے یہ عظیم کارنامہ ایک انسا پرداز، ایک مصنف، محقق،
نقاد، دکنی ادبیات کے ایک ماہرا در ماہر لسانیات کے زور قلم کے ذریعہ ہی
ہنیں بلکہ اپنی ذات کو ایک ادارہ میں تبدیل کر کے سر انجام دیا وہ مجسم تحریک مجسم
ادارہ اور عزم فارادہ اور عمل کی بے پناہ قوتوں کا مرچشمہ تھے۔

ڈاکٹر زور کے ساتھ جو تحقیقی کارنالے جو ادارے اور جو شخصیتیں والیں
ہیں اور جن کے ذریعہ ڈاکٹر زور نے اردو زبان دادب کے ایک کھوئے ہوئے درج
کی جس طرح بازا آفرینی کی اور اس کو جس طرح زندگی عطا کی اس کا انطباق کسی جائز
انتقادی کلمات سے کہیں بہتر کس مصور کے نقش ہی سے ممکن ہے اور دادب میں
مہت کم ایسی شخصیتیں گذری ہیں جن کے جهد و عمل نے مصوروں کے لیے نگارخانے
چھوڑے ہوں۔

اُردو کی ایک بے بدل شخصیت

پنڈت برج موسیٰ و تازیر کیفی

پنڈت برج موسیٰ و تازیر کیفی کی شخصیت بہ حیثیت مجموعی ایک ایسی ہمہ گیرا در بلند قامت شخصیت ہے جو کسی بھی زبان و ادب اور اس کی تہذیب کا سڑارہ سمجھی جاسکتی ہے خوش قسمتی سے شخصیت اُردو زبان اس کے ادب اور اس کی مشترکہ تہذیب کو میسٹر آف۔

کیفی کا تعلق اس مردم خیز سرزی میں سے ہے جسے جنت نشان کشمیر کہا جاتا ہے۔ یہاں کی خاک سے کتنے ہی جگہ لگاتے ہوئے لعل ویسا ہر بر صغیر کو نصیب ہوتے جنہوں نے اس بر صغیر کی سیاست اور تہذیب کو مالا مال کر دیا اقبال اور جلbert کی طرح کیفی کے آبا و اجداد کا تعلق بھی کشمیر سے تھا۔

پنڈت کیفی کا شمار اُردو کے ان گنچے چنے محسنوں میں کیا جاتا ہے جنہوں نے نہ صرف علمی، ادبی اور تحقیقی کاوشوں ہی کے ذریعہ اُردو زبان کی خدمت کی بلکہ اُردو زبان کی اشاعت و فروع میں عملی طور پر حصہ لیا۔ کیفی نے اُردو زبان اور اُردو تحریک کی جس لگنی، خلوص اور خاموشی سے خدمت کی اس کا

مسئلہ ملنا مشکل ہے۔ اردو زبان اور تحریک سے زندگی کے آخری لمحوں تک ان کی دل چپسوں میں کوئی فرق نہیں آیا اس زبان نے ان سے آخری وقت تک کسی فیض کیا۔ یوں تو ان کی ساری زندگی اردو زبان اور اردو تحریک کی خدمت سے عبارت ہے لیکن بالخصوص ملک کی تقسیم کے بعد اس میدان میں ان کی شخصیت بہت اہم اور نمایاں حیثیت حاصل کر گئی تھی۔ پنڈت جی کی شخصیت ہندو مسلم تہذیب کا خوب صورت امتزاج تھا۔ بچھلی صمدی کے بہترین مگر مٹے ہوئے نقوش اور آثار ان کی شخصیت میں پوری طرح جلوہ گز نظر آتے تھے۔ اردو زبان و ادب کی خدمت اور ہندو دل اور مسلمانوں میں بالہمی اتحاد کو انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔ کئی انقلابات گذر گئے اور زمانے نے کئی کروڑیں روپیں۔ لیکن ان کی ثابت قدمی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ازاں تدار تا دم مرگ زندگی کے اعلیٰ اقدار اور اپنے نصب العین سے ایک سچے عاشق کی طرح پیار کرتے رہے اور کبھی ان کی چاہ میں کمی نہیں آئی۔

پتھر کی چھاتی پہنچئے ہے میر عشق میں
جی جانتا ہے اس کا جو کوئی دفا کرے

اب ایسی دفعدار اور مخلص بزرگ ہستیاں کہاں جو تمام مصلحتوں سے دور اپنے عمل اور بر تاؤ میں اٹھیں اور بے لگ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ پنڈت کیفی اردو دنیا میں بڑی عزت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

پنڈت دناتریا کیفی کے ابتداء ۱۸۴۲ء میں صمدی کے آغاز کے بعد کشمیر سے دہلی منتقل ہو چکے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب معزز خاندانوں کے لیے فارسی دانی بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ انہوں نے فارسی میں عبر حاصل کرنے کے لیے مکتب

کی مروجہ تعلیم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے نانے سے بھی رجوع ہوئے جو اس زبان کے ایک جید فاضل سمجھے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے انگریزی تعلیم پر بھی پوری توجہ کی۔ انھیں چونکہ ہندی پر بھی عبور ہو گیا تھا اس لیے سنسکرت سے بھی اچھی خاصی داقفیت حاصل ہو گئی۔ اردو اور فارسی پر عبور نے انھیں عربی سے بھی اسی طرح آشنا کر دیا جس طرح کردہ سنسکرت سے آشنا تھے۔

رتن ناٹھ سپرشار، دیا شنکرنیم۔ چکبست اور پیم چند کی طرح کیفی بھی اردو کی ان نمائندہ شخصیتوں میں سے ہیں جو اس زبان کی بیواؤ کرنے میں اس کے دوسرے فرزندوں سے کسی طرح کرنے نہیں ہیں۔ یہ وہ نمائندہ شخصیتیں ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ اردو زبان کا تعلق کسی ایک ذہب، عقیدہ یا طبقہ سے نہیں بلکہ حقیقی معنی میں یہ ہندوستان کی قومی زبان ہے جو اپنے سیکولر کردار کی وجہ سے رابطہ کی زبان ہونے کے علاوہ مشترکہ تہذیب کی بھاشاہی ہے۔

غم دراز اس صورت میں یقیناً خوش تصدیقی بن جاتی ہے جب کہ اس کا ایک ایک پل رائیگاں نہ جائے۔ کیفی کا گنج گراں مائیم بھی محبت، دوستی، بھائی چارہ، نیکی، راستی، شرافت، وطن دوستی انسانیت دوستی کے اعلیٰ اقدار اور قابل قدر روایات کو پرداز چڑھانے میں صرف ہمارے چکی کیفی نہ جب آنکھیں کھو لیں تو ہندوستان کی تاریخ ایک کر دٹ لے تھی۔ اس وقت ساری دنیا تغیر اور تبدیلی کے فیصلہ کن مراحل سے گزر رہی تھی تغیرات اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلسل عمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں ایسے بھی مرحلے آتے ہیں جب تغیرات ایک قطعی شکل حاصل کر لیتے ہیں۔

کیفی جب پیدا ہوئے تو ہندوستان میں شاہی ختم ہو جکی تھی۔ جنگ

آزادی سنت ۱۸۵۷ کے ہنگاموں کا دور بھی گذر چکا تھا۔ ایک نئی تہذیب اور ایک نئی نزدگی پر صفتی کروٹ لے رہی تھی۔ انگریزی تعلیم کے ذریعہ ملک مغرب کی جدید تبلیغیں، جدید فکر اور فلسفہ اور نئی معاشی اور سماجی تبلیغیں سے آگاہ ہوتا جا رہا تھا۔ نئی صنعتی تصریحی میں کام آغاز ہو چکا تھا اور شاہی حاگیر داری اور زمین داری کے دور سے نکل کر ملک ایک نئے صنعتی دوسری دہلیز پر کھڑا ہو چکا تھا۔ پنڈت جی نے بھی ان نئی تبلیغیں اور نئے حالات کو دیکھا نئے تقاصلوں کو محسوس کیا اور قلامت سے سمجھنے رہنے کی بجائے جدید اور ترقی پذیر میلانات اور ریحانات کا خیر مقدم کیا۔ نئے علوم و فنون کی طرف راغب ہوئے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں قدیم اور جدید کا ایک متوازن امتزاج ہونے لگا۔ بنگال، پنجاب اور دہلی میں چلائی جانے والی تحریکات سے انھوں نے اپنے آپ کو وابستہ کیا۔ اردو کے ادیب، شاعر، محقق، عالم اور خدمت گزار کی حیثیت سے انھوں نے حالی اور سر سید سے گھرے اثرات قبول کیے اور اس کا اظہار صرف اپنی تخلیقی ہی میں نہیں کیا بلکہ اپنی ساری شخصیت سوچنے اور سمجھنے کے اندازا اور اپنے طرزِ زندگی میں بھرپور انداز میں کیا۔

اس کا ایک کھلا ثبوت پنڈت کیفی کا مدرس "بھارت درپن" ہے جو ۱۹۰۵ء میں تصنیف کیا گیا۔ جس طرح حالی نے مدرس لکھ کر مسلمانوں کو جنبشی نے اور خواب غفتہ سے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی بالکل اسی طرح پنڈت کیفی نے بھارت درپن میں ہندوستان کی عظمت اور عروج کے دلکشی یاد دلاتے ہوئے اس دور کے نعالیٰ اور پیشی کا نقشہ کھینچ کر ہندوستان کو قبریذت

بے نکلنے اور ترقی کے راستہ پر آگئے بڑھنے کے لیے اکسایا۔

پنڈت کیفی کو شعر و سخن کا ذوق و رش میں ملا تھا۔ انھوں نے کم عمری ہی سے شعر کہنا شروع کیا اور شاعری کی ابتداء مرداج زمانہ کے مطابق غزل گوئی سے کی لیکن جدید روحانیات اور تحریکات کے زیر اثر نیچرل شاعری کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ یوں تو پنڈت جی نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی زیادہ تر توجہ غزل اور نظم کی جانب ہی رہی۔

ان کی غزلوں میں زیان دہیان کی چاشنی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سماں محاورہ کا لطف اور تاثیر کی خصوصیت بھی پائی جاتی ہے اور دلستانِ دہلی کا انداز جگہ جگہ اپنے آپ کو آشنا کرتا ہے۔

ان کی نظیں مناظر فطرت کی حیثیں عکاسی اور زیان دہیان کی دلشی کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ لیکن جو چیز خصوصیت کے ساتھ ان کے کلام میں نہیں آتی ہے وہ ان کی قادر الکلامی اور کہنہ مشقی ہے۔ قاری ان کی شاہری کی اس خصوصیت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شاعری کے علاوہ ادب کے بعض دیگر اصناف مثلاً افسانہ، ناول اور ڈرامہ پر بھی پنڈت کیفی نے توجہ کی ہے۔ لیکن درحقیقت لسانیات اور تحقیق ان کا خاص میلان ہے۔ ان موصنوں کا دوران کی دل تصانیف منتشرات۔ کیفیتی اور دیگر چند مضامین موجود ہیں۔

نشرات سنہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ جس میں وہ ۱۱ علمی فادی لکھ را در مضمایں شامل ہیں جو سنہ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۳۲ء کے دوران میں لکھے گئے۔ ان میں چند لکھ را موم عثمانیہ حیدر آباد۔ اردو سبھا لاہور، انگریز اردو لکھنوا اور انگریز ارباب حلم

لاہور میں دیئے گئے تھے۔ ان خطبات اور مصنایمن میں ایک خاص قسم کا بیط موجود ہے اور وہ ہے اردو زبان سے پنڈت کیفی کی بے پناہ محبت اور اردو ادب کی ترقی اور فرد غیر کے لیے ان کے پُر خلوص مشورے۔

اردو زبان اور ادب کی ترقی و توسیع میں قدمانے جو کام بائے نمایاں انجام دیئے تھے اور زبان کی تدوین و تزئین کے جواضیں و ضع کیے تھے ان کا جائزہ لیتے ہوئے زبان و ادب کی ترقی کی موجودہ رفتار پر پنڈت کیفی نے بڑی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اردو زبان میں اس دور میں جو بے راہ روی پیدا ہو رہی تھی اس سے وہ بے حد خالف تھے۔ ان کے خطبات اور مصنایمن میں جگہ جگہ زبان کی غلطیوں کے بارے میں اشارے مثالیں اور عالمانہ بحثیں ملتی ہیں۔

دہ عربی و فارسی الفاظ اور تراکیب سے اردو کو مشکل اور تھیل بنانے کے مخالف تھے۔ انھیں پروفیسر حید الدین سلیم سے مکمل اتفاق ہتا کہ اگر اردو کو ہندوستانی زبان بتانا منتظر ہے تو اسے عربی ایرانی کی بجائے ہندوستانی زبان بنایا جائے۔

علیٰ استطاعت میں ترقی کے ساتھ وہ زبان کی لطافت اور ترمیم کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ الفاظ کے ذخیرہ میں اضافہ اور زبان کی اصلاح و ترمیم کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کو مد نظر رکھنے کی بھی تاکید کرتے ہیں کہ جو خوبیاں پہلے سے اردو میں موجود ہیں وہ کہیں زائل نہ ہو جائیں انھوں نے زبان کے نقاصلص، عیوب اور کمزوریوں کی اصلاح اور مختلف بیساں میں تذکیر و تائیث و متردکات وغیرہ کے اختلافات کو درکرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے معقولیت، بالغ نظری اور فراخ دلی کو پیش نظر رکھنے کا

مشورہ دیا۔ وہ ان مسائل کو حل کرنے پر زور دیتے ہوئے اردو والوں سے ہانی کی روشنی میں اعلیٰ اور معیاری کارنالے سر انجام دینے کی جانب توجہ دلاتے ہیں۔ متذکرہ بالا مسائل اور زبان اور ادب کی جانب بے تو جھی کا عالم دیکھ کر انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں یہ سست رفتاری اور غفلت جمود کی کیفیت نہ اختیار کرے اور اردو زبان آثار قدیمہ بن کر نہ رہ جائے۔

اردو زبان و ادب کے جن چند مسائل کا متذکرہ ان خطبات اور مصاین میں ملتا ہے وہ مسائل موجودہ مسائل سے یقیناً مختلف ہیں۔ مسائل کی تبدیلی، حالات کی تبدیلی کا منطقی نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ کتاب اس دور کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

پنڈت کیفی نے لسانیاتی موصوعات پر کئی مصاین قلمبند کیے تھے جو کیفیہ کے نام سے سنہ ۱۹۳۲ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ جیسا کہ خود پنڈت کیفی کہتے ہیں۔ برسوں کی تحقیق، مطالعہ اور سوچ بجا کارکے نتیجے اس کتاب میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کو اردو لسانیات کے ابتدائی اہم کاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پہلے باب میں اردو زبان کی مختصر تاریخ کے تحت زبان کے آغاز و ارتقا کی کھوچ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس وقت اس میدان میں جو تحقیقی کام ہو چکا تھا اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی ہمہ گیر معلومات کی روشنی میں پنڈت کیفی نے جونتائج اخذ کیے ہیں ان سے آج اخلاف ممکن ہے کہیں کہ پنڈت کیفی کی اس تصنیف کے بعد اس موضع پر، سائنسیں گرد بیان دوں پر کافی تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ اور چند نئے نظریات سائنسے آئے ہیں۔ تاہم اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ پنڈت جی کے تمام مأخذ مستند اور معتبر ہیں اور

موضوع سے ان کی واقعیت بہت گھری ہے امّا انہوں نے اپنی وسیع معلومات کی روشنی میں بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے درستے ایجاب میں زبان کے بنیادی عناصر کے بارے میں تمام بحثیں غالباً علمی ہیں اور جو فکات بیان کیے گئے ہیں وہ بہت اہم اور پیش قدمیت ہیں تحقیق صبر آزمایا اور مختصر طلب کام ہے جس میں وسیع معلومات اور وقت نظری درکار ہے۔ پندرٹ کینی نے اپنی تصنیف اور تحریروں میں تحقیق کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ علمی اور فنی مذکورہ نکات کو واضح اور سلیس انداز میں بیان کرنے پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ آج جیکم اردو لکھنے والوں کی تحریریں میں زبان کی غلطیاں عام ہیں اور صحت زبان سے لاپرواں بر قی جا رہی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ بہت کارآمد اور مفید ثابت ہو گا۔

علم لسانیات، قواعد، محاورہ اور روزمرہ سے انھیں ابتدائی سے دل چسپی تھی۔ اردو میں الشاعر امداد خاں انشاء کی تصنیف "دریائے لطافت" اس موضوع پر سب سے پہلی اور پڑی اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کو مولوی عبد الحق نے مرتب کر کے طبع کر دایا تھا۔ لیکن جب مولوی صاحب نے محسوس کیا کہ کتاب فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے پڑھنے والوں کا دائرہ محدود ہے تو انہوں نے طبع ثانی میں اس تصنیف کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ ترجمہ پندرٹ کینی نے کیا جو بہت سلیس رواں اور بامحاورہ ہے۔ اس کتاب میں کئی مفید حوالشی بھی شامل ہیں جن سے قاری پاہم نکات واضح ہو جاتے ہیں۔

عمر کے معاملے میں قدرت نے کیفی صاحب کو پڑھی فیاضی سے نوازا تھا۔ تقریباً پون صدی تک علمی، ادبی، شعری تحقیقی عرض یہ کردہ اردو زبان سے

متخلص ہر قسم کی تعمیری اور با مقصد سرگرمیوں اور تحریکیوں سے والستہ رہے پنڈت کیفی کے انتقال پر ڈاکٹر ٹزو نے ان کی شخصیت کو پر اثر الفاظ میں خراب عقیدت پیش کیا تھا انھوں نے لکھا تھا کہ "ان کی دفات سے اردو دنیا ایک ایسے محسن سے بحروم ہو گئی ہے جس کا بدل طذا ممکن نہیں ہے۔ اردو میں شاعر ادیب، ماہر لسانیات اور عربی دعوای خدا کے جدا جدا ماہر پیدا ہوتے رہیں گے۔ لیکن شاید ہی کوئی ایسا پیدا ہو جو ان سب میں پنڈت کیفی کی طرح ایک خصوصی اہمیت کا مالک ہو۔"

کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ پنڈت کیفی کی قابلِ احترام شخصیت اور گران قدر خدمات، اور کارناموں کو اردو دنیا نے فراموش اور نظر انداز کر رہا ہے حالانکہ پنڈت کیفی ماضی قریب کی چند اہم شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پنڈت کیفی کی شخصیت اور کارناموں پر تحقیقی کام کیا جائے اور ارددادب میں ان کی جگہ منعین کی جائے۔ اردو والوں کی اس بارے میں خفقت پنڈت کیفی کے ساتھ ناالضائق تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کو تاہی کے سبب اردو لسانیات اور تحقیق کے ارتقا کی کہانی بھی ادھوری رہ جائے گی۔

مخدوم — چند یادوں

اس مضمون میں نہ تو مخدوم صاحب کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا، اور منہجی یہ مضمون ان کی شخصیت کے سبھی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ اس میں ان چند یادوں اور باتوں کا تذکرہ ملے گا جنہیں میں اپنی کتاب "مخدوم" — ایک مطالعہ" اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد لکھ گئے اپنے مضافاتی میں شامل نہیں کر سکا تھا۔ اس مضمون کو قلمبند کرنے سے میرا خیال ہے کہ یہ چند یادوں ضرور محفوظ ہو جائیں گی ساتھ ہی ساتھ مخدوم صاحب کی شخصیت کے چند نقش بھی کہیں نہ کہیں ضرور ایصریں گے۔

مجھے تھیک سے یاد نہیں کہ میں نے مخدوم صاحب کا نام کب سناتھا۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان کے چھپے گھر گھر اور شہرت افسانہ درا فسانہ سار شہروں پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں جیل سے رہائی کے بعد ان کے اعزاز میں شاندار خیر مقدمی جلسے منعقد ہوئے عظیم الشان جلوس نکال لئے گئے۔ اس وقت وہ اپنے علاقے میں عوام کی مقبول ہی نہیں محبوب اور مرکزی شخصیت بن گئے تھے۔

ہم اپنے راستوں میں گھر میں محلہ میں بازار میں ہر جگہ بڑے انتیاق کے ساتھ ان کے متعلق باتیں سنتے اور حیرت اور مسخرت کا اظہار کرایا کرتے تھے۔ اس کے بعد کئی سال گزر گئے۔ شعور کی بختیگی کے ساتھ ہی ساتھ بھیثت شاعر دعویٰ می رہنا مخدوم کی شخصیت افسانوی پیرا ہن میں نہیں بلکہ حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آئی لیکن مخدوم کو قریب سے دیکھنے کا موقع پہلی بار اس وقت میسر آیا جب حیدر آباد میں چند بادوق نوجوانوں نے جنہیں دوسری دل چسپیوں کے علاوہ فلموں سے بھی گھرالگا دھما۔ فلم اسٹڈی سرکل کے نام سے ایک ادارہ کی بنادیا تھی۔ اپنی طرز کے اس پہلے اور اچھوٹے ادارے کی صفائح کے لیے ان نوجوانوں نے جن میں خوش قسمتی سے میں بھی شامل تھا مخدوم صاحب کا انتساب کیا تھا حالانکہ مخدوم صاحب کو فلموں سے نہ تو خاطر خواہ دل چسپی تھی اور نہ ہی دل چسپی لینے کے لیے وقت تھا۔ ان کا ماحدوں بھی اس کے لیے سازگار نہیں تھا۔ ہم نوجوان چاہتے تھے کہ مخدوم کی ہمہ جہالت شخصیت فلموں کے تعلق سے بھی دل چسپی لے۔ خیریہ ایک علمدار بحث ہے۔ مجھے تو صرف یہ بات لہنی ہے کہ اس سرکل سے اپنی داشتگی کی وجہ سے میں پہلی بار مخدوم صاحب سے قریب ہو سکا۔ اس ادارہ کی افتتاحی تقریب بھی کئی باتوں کی وجہ سے ایک یادگار تقریب تھی۔ لیکن اس تقریب کے اس منتظر کو میں کبھی نہیں بھول سکتا جب فائن آرٹس اکیڈمی کے فن کار کوڈس کی شکل میں چاند تاروں کا بن ساز کے ساتھ اسٹچ پر پیش کر رہے تھے۔ اس نظر کی معنویت اور اشارت کے ساتھ سامعین کی محیت اور دل چسپی اور فن کاروں کا ذوب کر اُسے سنانا، نغمہ، معنی اور تاثر کا ایک ایسا امتزاج میا۔

کر رہا تھا کہ اس کیفیت کو محسوس ہی کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا یہ سے زیادہ متاثر اس تقریب کے مہماں خصوصی بلراج ساہنی تھے جن کی اہمیت اداکار ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ادیب، دانش درادر ترقی پسند فن کار ہونے کی وجہ سے تھی۔ فن کاروں نے جب یہ کوئی ختم کیا تو سارا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ صرف ایک شخص تالیوں کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں اپنے آپ کو معذور پا رہا تھا اور وہ تھے بلراج ساہنی کیونکہ ان کی آنکھوں سے آنسو چاہی تھے۔ چنانچہ تاروں کا بن کا سالاپس منتظر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ شہریوں کے جلتے ہوئے تن گویا انھیں آنکھوں کے سامنے نظر آ رہے تھے جب فن کاروں کی زبان سے نکلا تشنگی تھی مگر۔۔۔ تو گویا انھیں اس کیفیت کا احساس ہوتے لگا جس سے جدوجہد آزادی کے زمانے میں وہ اور ان کے ساتھی سرشار ہو چکے تھے۔ بلراج ساہنی نے بے اختیار روئے ہوئے بھراہی ہوئی آواز میں اور بڑے ہی متجیاہ انداز میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر یہ فن کار ایک باز پھر نظم سادیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔ چنانچہ ایک بار پھر اسی انداز میں بلکہ اور بھی) متاثر ہو کر ان فن کاروں نے مخدوم کی نظم "چاند تاروں کا بن" سنائی۔ اس سے قبل یہ فن کار سینکڑوں مرتب نظم پیش کر رہی تھے۔ لیکن اسی بارجو کیفیت پیدا ہوئی جو سماں نغمہ و معنی نے ہم آہنگ پرکر رہا تھا کچھ اور ہی عطا۔ مخدوم کے اشعار میں کتنی قوت ہے، تا تیر ہے اور معنی رنگوں کی جو گمراہی ہے اس کا زندہ ثبوت پہلی بار میری آنکھوں کے سامنے تھا اس تقریب میں مخدوم بھی تھے تقریب کے اختتام کے بعد کافی دیر تک بلرج ساہنی اور مخدوم کے ساتھ ہم تو ہواں کو نمائش کلب میں بیٹھے ہاتھی

کرنے کا موقع ملا۔ بل راج ساہنی نے جس کیفیت کا انہار لپنے آنسو دل سے کیا تھا بات چیز کے درزان میں، انہوں نے الفاظ میں بھی اُسے ظاہر کیا۔ مخدوم اس سارے داقعہ میں بڑے خاموش لیکن سا تھری سا تھبے ھڈسٹرہ اور مٹھن دکھانی دے رہے تھے۔ شاعر کو اور کیا چاہیے۔ ایسی داد ملنے تو شاعر یقیناً اسے کسی بھی ایوارڈ اور اعزاز سے بڑا ہی سمجھے گا۔

اس تقریب کے بعد مخدوم کے سا تھ عقیدت اور محبت کا رشتہ اور بھی اسوار ہوتا گیا چنانچہ جامعہ عثمانیہ سے اردو میں ایم۔ اے کرنے کے لیے جب مقالے کے لیے موضوع کے انتخاب کا سوال آیا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یکوں نہ اس جامعہ سے یہم۔ اے کرنے والے اس کے بہترین پیوں مخدوم کو اس مقالہ کا موضوع نہ بنایا جائے میرے اس انتخاب پر کچھ لوگ چونکے گئے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا جب جامعہ عثمانیہ میں ایم ملے (اردو) کے لیے حیدر آباد کی ایک ادبی شخصیت کو مقالہ کا موضوع بنایا گیا تھا جو ہمارے دبر را یک بیتی جاگتی لیکن قدر آور ادبی شخصیت تھی۔ روایت سے اس انحراف کے باوجود کسی نے میرے انتخاب کی مخالفت نہیں کی کیونکہ ایسی مخالفت ادبی بد دیانتی کے متراود ہوتی۔ مخدوم صرف حیدر آبادی کی مرکزی ادبی شخصیت نہیں تھے بلکہ وہ ساری اردو دنیا میں لپنے ہم عصر شعراء اور ادبی شخصیتوں میں نہایت اہم پیداگانہ اور نامور شخصیت تسلیم کیے جاتے تھے۔

جہاں تک مخدوم کے سیاسی نظریات اور عقائد کا تعلق ہے اس سے میں ان کی استقامت ان کی شخصیت کا ایک واضح مگراہم پہلو ہے۔ ان کا بچپن مدرسی ماحول میں گزارا۔ فوجوانی میں اشڑا کی نظریات کے مطالعہ

اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنے کے بعد انہوں نے ان نظریات اور عقائد کو اپنایا اور بلا کسی تاخیر کے عملی طور پر کام کا آغاز کر دیا۔ وہ ان نظریات کا گرا مطالعہ کر سکتے ایک دانشودہ کی صیغہت سے اس فلسفہ حیات کی تعبیر اور تبلیغ کر سکتے تھے۔ کوئی بھی ایسا دوسرا راستہ آسانی کے ساتھ اختیار کر سکتے تھے جو معاشی آسودگی میں بھی محمد و معاون ثابت ہوتا لیکن انہوں نے دشوار گزار راستہ کا انتخاب کیا اور پورے خلوص کے ساتھ اپنے مشن کا آغاز کیا۔ کسی اونچے اور بلند مقام پر نہ کم ہو کر پدائیات دینے کی وجہ سے ایک کسان کی طرح اپنے ہاتھوں سے کاشت کر کے اپنی محنتی کاشت پانے کی کوشش کی۔

ان کی روزمرہ صور و فیض کو چند روز قریب رہ کر دیکھنے پر اس بات کا کوئی بھی بأسانی اندازہ کر سکتا تھا کہ انھیں اپنے کام اور مشن سے کتنی والہانہ دل چسپی تھی اور وہ اپنا کام کس خلوص اور انہماں سے کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ کسی بھی گوشہ سے ان پر ایسا الزام نہیں لگا یا گیا جیسا کہ عام طور پر اسی دانوں پر لگایا جاتا ہے ان کے تصورات اور نظریات سے اختلاف کیا جاسکتا تھا لیکن ان کے خلوص، بے نفسی اور ان کی بے لوث خدمات پر کسی کوشش نہیں تھا۔ وہ بہت بڑے سیاست دان نہ سہی۔ میکن سیاست کے دلائل میں ایک ایسے گل تر کی طرح تھے جس کی دل آؤزی مٹا لی تھی۔ سیاسی زندگی میں ان کی شرافت، وضع داری، خاتمی بے عرضی، ایثار و قربان اور اُپنے اصولوں اور اعلیٰ اقدار سے ان کا بے پناہ پیارا انھیں اپنے ہی میں نہیں سیاسی بیگانوں کی نظر میں بھی بلند کر چکا تھا۔

اجماعتی زندگی میں جس نے ان کا جو وہ دیکھا اس سے متاثر

ہو گیا۔ کوئی شاعر مخدوم کا فریضہ تھا تو کسی کو غواصی رہنمائی حیثیت سے ان کی شخصیت میں بڑی کشش نظر آتی تھی دوستوں کی مiful میں وہ ایک بہترین دوست تھے۔ بذلہ سخوں، لطیفہ گوؤں، زندہ دلوں کی نشست میں ان سے بہتر بذلہ تن اور ان سے اچھا لطیفہ گو نہیں مل سکتا تھا۔ ان کی بذلہ سخنی اور لطیفہ گوئی کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ اردو ہال میں انہم ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے اجلاس کے بعد کسی صاحب نے ڈاکٹر گورے مخصوص لطیفہ سنانے کی خواہش کی تاکہ مسائل پیغور و خوص کے بعد تجدیدہ ما جوں شکستہ ہی جائے۔ گورہ صاحب نے کہا۔ جس مiful میں مخدوم ہوں ہال کسی اور کو لطیفہ سنانے کا حق نہیں پہنچتا۔ میں اردو ہال اپنے مقالہ کے سلسلہ میں بات چیت کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس مiful میں سب ہی مخدوم کے بے تکلف دوست نہیں تھے۔ ان میں چھپوئے ہوئے بزرگ اور ایسے حضرات بھی شامل تھے جن سے مخدوم کی زیادہ بے تکلفی نہ تھی لیکن مخدوم کے شکر فے شروع ہو گئے۔ انہوں نے اپنے لطیفہ گولی کے انداز کو ما جوں کا لحاظ کرتے ہوئے ڈھال لیا تھا۔ کافی دیر تک تھبی گوئی رہے۔ چند لطیفے ہال موجود ایک خاص دوست کو ٹھارگٹ بنایا کرنا ہے گے تھے۔ اردو ہال کی اس مiful کے درخواست ہونے پر جب میں مخدوم صاحب کے ساتھ واپس ہو رہا تھا تو مخدوم صاحب کو رخصت کرنے والے اس خاص دوست اور ساٹھی کو بے مزہ نہیں پایا۔ محسنو عی نارا ضمیگی لیکن حقیقی معنی میں شکر گزاری کے لیے میں جیسے وہ کہہ رہے تھے، سنانے والے کے لب اتنے شیری ہیں کہ گالیاں کھا کے بے مزہ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لطیفے تو لطیفے ٹھہرے۔

جن دلوں میں مخدوم پر مقالہ لکھنے میں مصروف تھا میں نے مخدوم کے ایک

قریب اور عزیز دوست میر حسن صاحب سے بھی انٹر دیا تھا۔ میر صاحب نے جو طالب علمی کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی برسوں مسلسل مخدوم کے ساتھ رہے تھے مجھے تفصیلی انٹر دیو دیتے ہوئے ایک واقعہ سنایا تھا جس سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ مخدوم حیدر آباد میں روپوشی کے وقت بھی ایک ہیرد کی طرح مقبول تھے۔

جس وقت مخدوم روپوش ہو گئے تھے۔ میر حسن صاحب اور نگ آماد میں تھے۔ چند روز بعد وہ حیدر آباد آئے۔ موڑ میں عابر روڈ کے ایک ہوٹل پر ہنپ پر چائے منگوائی۔ آن کے دوست سرور بیانی بھی ان کے ہمراہ تھے جس قوت دہ اور ان کے دوست موڑ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ چند لوگ انھیں لغور دیکھ رہے ہیں۔ چند ہی منٹ میں ۳۰، ۲۵ افراد موڑ کے قریب ہنپ پر گئے۔ ہوٹل کے تقریباً سب ہی ملازمین اور مالک کے علاوہ چند اور بھر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی طرف دیکھ رہے تھے ان میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں ایک رسالہ تھا اور ۵، ۶ آدمی بار بار اس رسالہ کو دیکھتے تھے اور بھر ان کی طرف دیکھتے تھے۔ چلئے ختم ہوئی تو میر حسن صاحب نے ہوٹل کے ملازم کو جو بازوں ہی کھڑا تھا ایک روپیہ کا نوٹ دیا مگر ہوٹل کے مالک نے فوراً آگے بڑھ کر کہا "صاحب آپ آگئے، ہم کو بہت خوشی ہوئی۔ ہم آپ سے پیسے نہیں لیں گے"۔ میر حسن صاحب کو فوراً خیال آیا کہ وہ لوگ انھیں مخدوم سمجھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے موڑ میں سے اتر کر ان لوگوں کو سمجھایا کہ انھیں غلط فہمی ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے پاد جود ان لوگوں نے پیسے نہیں لیے اور بڑی دیر تک مخدوم کی قصیدہ خوانی کرتے رہے۔ اس مجمع میں ہتدوں مسلم

امیر، غریب سمجھی شامل تھے۔

عام طہر پرن کارکے مزاج میں لا اد باتی پن اور زندگی کی جانش
غیر ذمہ دارانہ روایہ پایا جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں نظر و ضبط شاذ ہی ملتا ہے
لیکن مخدوم کی شخصیت اس عالم تاثر کی صدقہ تھی۔ فن کار اور زندگی میں نظر و ضبط
یہ دو باتیں ان کی شخصیت میں ایک دوسرے سے مستضاد نہیں بلکہ یہ جانظر اتنی تھیں
مقامے کی تیاری کے دوران اور اس کے بعد بھی کئی بار مخدوم صاحب
سے ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا۔ تقریباً ہر دفعہ پہلے ہی سے ملاقاتوں کا وقت
مقرر ہوتا۔ کبھی بھروسہ بھی پاری آفس پر ملاقات کے لیے جانا پڑتا وہ اکثر ملنے
کے لیے علی الصبح وقت دیتے تھے اور شاید ہی ایسا ہوا، ہو کہ مقررہ وقت پر
وہ موجود نہ رہے ہوں جبکہ میں ان سے ملاقاتوں کا وقت لے گر دو ایک باز مقرر
وقت پر پہنچنے لے سکا۔ رات کتنی ہی ریت کے جاگے ہوں وہ اپنے ہرنئے دن کی
مصور دنیا کا آغاز برصغیر کی ابتدائی ساعتوں ہی سے کرتے تھے۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے انٹر دیو کے دوران میں چند رومانیوں
کے پیش نظر کی وضاحت چاہی۔ ان کی وضاحت پر میں نے چند سوالات پوچھے
اور تفصیلی جوابات کی درخواست کی وہ تفصیلات بیان کرتے ہوئے ایک لمحے
کے لیے ڈک گئے اور بھراں بارے میں کچھ نہ کہا اور یہ بھی ہدایت کی کہ ان تفصیلات
کے بیان سے احتراز کیجئے۔ تنازع صریحاً کرنا اور تعلقات بگاڑنا مناسب نہیں۔ اس
وقت شاعر مخدوم کا رد یہ ایک باشور اور ذمہ دار شہری کا رد ہے تھا۔ انھیں اپنی ذمہ داریوں کا
پورا پورا احساس تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بے شمار لوگ ان سے کیا توقعات رکھتے ہیں اور انھیں کتنا
اوپر اپنے مقام دیتے ہیں۔ وہ ان توقعات، ہذبات اور احساسات کو تھیں نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔

اسد اللہ وجہی

مولوی عبد الحق کے اردو ادب پر یوں توبہ شے احسانات میں لیکن وجہی کو اردو کے علمی دادبی حلقوں میں روشناس کر کے اردو ادب پر مولوی عبد الحق نے جو احسان کیا ہے اس سے آسانی سے بھلا یا نہیں جا سکتا۔ مولوی صاحب کا یہ کارنامہ صرف اس وجہ سے ہی قابل قدر نہیں ہے کہ انہوں نے سارے ہی میں سو سال پرانے قطب شاہی دور کے ایک نظرنگار اور شاعر و جہی کو دریافت کیا بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ انہوں نے ایک ایسے بلند پایہ تخلیقی فن کارا در ترشے ہوئے ہمیرے کی دریافت کی جس کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں اور چمک دمک سے معاصرین کی شہرت دمکت ماند ہے گئی اور جو آج بھی پوری آپ و تاب سے چمک رہا ہے اور سبک کی آنکھیں خیرہ کیے ہوئے ہے۔

وجہی کا اصلی نام اسد اللہ تھا اور تخلص وجہی۔ اس نے چار قطب شاہیوں کا دور دیکھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں دکنی زبان کے نامور شاعر کی تخلیقی سے شہرت حاصل کی اور اسے یہاں تک عروج حاصل ہوا کہ میر و نشی

کے دربار میں اسے ملک الشتراء کا منصب عطا کیا گیا اس نے اپنی مشہور ثنوی قطب مشتری اسی دور میں لکھی۔ محمد قلی کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کے دو میں وجوہی نے بڑے دن دیکھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ وجہی سے ناخوش تھا۔ نہ صرف شاہی دربار سے اس کی وابستگی ختم ہوئی بلکہ اس دور میں مالی پریشاںوں کے ساتھ ہی ساتھ ساخت تخلیفیں بھی اٹھائیں۔ جوہی نے تقریباً پندرہ سال اسی طرح پریشاںوں میں کامے۔ لیکن سلطان محمد قطب شاہ کے بعد جب سلطان عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا تو گولکنڈہ کے دربار کا ماحول بدل گیا۔ بھروسے شعر و ادب کو شاہی سر پستی اور ادیبوں اور شاعروں کو قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ وجہی جیسا پختہ کارا اور بلند پایہ تخلیقی فن کار سلطان عبداللہ قطب شاہ کی توجہ سے کس طرح دور رہ سکتا تھا چنانچہ وجہی کو نہ صرف دریا میں رسائی حاصل ہوئی بلکہ وہ لطف و کرم سے بھی نواز آگیا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر ہی وجہی نے "سب رس" جیسی بے مثل کتاب تصنیف کی۔

عبداللہ قطب شاہ کے دور کا شاہی سورخ نظارہ مولانا شیرازی اپنی تصنیف "حدیقتہ السلاطین" میں وجہی کا تذکرہ دکنی شاعر کی حیثیت سے کرتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں وجہی ایرانی یا تورانی، هر یا کسی اور غیر ملکی کی حیثیت سے نہیں بلکہ دکنی کی حیثیت سے مشہور تھا۔

تقریباً دس سال قبل وجہی کا ایک صنیع فارسی دیوان دریافت ہوا ہے۔ جو سالار جنگ لاہوری کے شیرخنہ طویلات میں محفوظ ہے۔ اس مخطوطہ کی دریافت پر بخوبی اختہ حسن کا مضمون "قطب مشتری اور سب رس کے مصنف ملا وجہی کے بارے میں نئی معلومات" بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

وجہی کی زندگی کے حالات کے بارے میں ہمیں کوئی موارد مستیاب نہیں تھا۔ قطب شاہی تائیخیں اور تذکرے وجہی کے بارے میں سوا اخنی مواد فراہم نہیں کرتے۔ فارسی دیوان کی داخلی شہزادتوں سے اُردو دنیا اس عظیم فن کا رکے ہمیں نام آبائی وطن، قطب شاہی بادشاہی سے اس کے تعلقات اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز سے ماقف ہوئی ہے اس اعتبار سے تو فارسی دیوان کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن اس دیوان کے دریافت ہونے اور اس کے مطالعہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وجہی فارسی کا بھی بڑا شاعر ہے اور فارسی میں اس کا کلام کسی طرح اس کے معاصر ایرانی شاعروں سے کم نہیں ہے۔

دکنی میں وجہی کی دو تصانیف ہیں قطب مشتری و سب رس۔ اس کے علاوہ ایک نشری رسالہ تاج الحقائق کو بھی وجہی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس رسالہ کے مصنف کے بارے میں ناقیدین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ دکنی شاعری میں وجہی کا مقام بہت بلند ہے وہ اساتذہ فن میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کے شاعرانہ مرتبہ کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ محمد قلی قطب شاہ جیسے زبردست دکنی شاعر کے دربار کا ملک الشعرا، تھا۔ اس کی مشنوی قطب مشتری ایک اہم شعری کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔ اس مشنوی میں اس نے محمد قلی قطب شاہ کے معاشرے کو افسانوی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مشنوی کے بیان میں کہیں کہیں چند غزلیں اور رباعیاں بھی آگئی ہیں اور اتوں ابتداء تا آخر وجہی کی قادر الکلامی عیال ہے۔ دکنی میں وجہی کی شاعرانہ حیثیت مسلسلہ ہے لیکن جس نے وجہی کو اُردو ادب میں زندہ جاوید بنا دیا وہ اس کی خوشی تصنیف "سب رس" ہے "سب رس" وجہی کا ده نشری کارنامہ ہے جو بلاشبہ قدیم

اُردو کے نثری ادب کا سرمایہ ناز و آبرو ہے اور جسی پر اُردو ادب بجا طور پر خنز کر سکتا ہے۔ قدیم اردو میں سب سے قبل جو مرلوٹ نثری کارنامے ملتے ہیں ان سب کا شمار مذہبی نثر میں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ یا تو بیز رگان دینی و صوفیائے گرام کی تصنیفات ہیں یا ان کے ملفوظات و ارشادات ہیں۔ اس طرح وجہی کی تصنیف سب رس اردو میں ادبی نثر کا سب سے پہلا نمونہ قرار پاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ سب رس اردو میں تمثیل نگاری کا بھی سب سے پہلا نمونہ ہے۔ محمد بن سیدک فتحی نیشاپوری کی مشوی دستور عشق اور نثری قصتے حسن دل، سب رس کے ماخذ میں لیکن وجہی نے تفصیل سے احتراز کرتے ہوئے ماخذ کے کمی حصے حذف کر دیئے ہیں۔ اور اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ نہ بھی کیا ہے۔ قرآن مجید کی آیات، احادیث اور بیز رگان دینی کے اقوال کے علاوہ مختلف زبانوں کے اشارہ، اقوال، محاورے اور کہا و میں جگہ جگہ نقل کی ہیں۔

سب رس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی زبان اور اسلوب بیان ہے۔ عربی اور فارسی میں صفتائی و بدائی کی جو قدیم اور عنطیم الشان روایت ہے اس سے وجہی نے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ عبارت کی آرائش اور فنا فیر کی پابندی کے باوجود اس کا طرز بیان تکلف و تضیع سے پاک ہے۔ معنی دسجع اور رنگیں عبارت کے باوجود وجہی کا اسلوب سلیس اور شگفتہ ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وجہی نے ریزہ کاری نہیں کی ہے بلکہ یہ اس کی تخلیقی جبلت میں داخل ہے۔ اپنے اسلوب کے بارے میں وہ لکھتا ہے۔

”جتنے چو ساران، جتنے فہم داران، جتنے گن کاران ہوئے سن آج،
لگنی کوئی اس جہاں میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت ہیں چندان“

سون نظرم ہولنڈر ملا کر گلا کر نہیں بولیا۔

و جہی کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے کہ وہ اس اسلوب کا موجود ہے۔
و جہی سے پہلے کے نثر نگار صرف اپنا مافی الضمیر بیان کر رہے ہیں پر اکتفا کیا کرتے
تھے۔ ان کی تحریریں ادبی نثر کے لوازم سے یکسر مفقود ہیں۔

سب رس کے اسلوب میں جو دل کشی اور حسن ہے جو غمگی و ہوسیقیت
ہے اس کا اندازہ اس کتاب کے بالکل ابتدائی جملوں سے کیا جا سکتا ہے وہ
کہتا ہے۔

"تمام مصحف کا معنی الحمد للہ میں ہے مستقیم، ہور تمام الحمد للہ کا
معنی بسم اللہ میں ہے۔ قدیم ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے
میں رکھیا ہے کریم سیح دیکھ خاطریاً اتل حديث بھی یوں آئی ہے کہ العلن نقطہ"
و کنز راجہہال یعنی علم یک نقطہ ہے جاہلان اسے بڑھا رے جہالت کوں اس عد
لگن لیا یئے۔ ہور فارسی کے دانشمندان جنون سمجھتے ہیں باتاں کے بندان انوں کو
یوں بھایا ہے انوں میں بھی یوں آپا ہے کہ "اگر درخانہ کس امرت یک حرف لیں ہے"
ہور گواہیر کے چاتراں گوں کے گوار، انوں بھی بات کوں کھو لے ہیں۔ یوں بولے ہیں۔
و جہی کے ان فقروں میں عربی فارسی اور ہندوی الفاظ شامل ہیں
لیکن ان الفاظ کا امتزاج کوئی لفظی توجہ نہیں بلکہ یہ ایک تخلیقی عمل کا ذریتی
نتیجہ ہے۔ یہ تخلیقی عمل نہ صرف ان سہ لسانی صورتی امتزاج کا حامل ہے بلکہ
ان کی ترتیب و تشکیل میں خنانی اصول شامل ہے اور اس میں جو جیز بنیادی
طور پر کارفرما ہے وہ ہے آدازوں کا مخفی حسن۔

سب رس کے مذکورہ بالاجملوں سے قطب شاہی عہد میں علم کے

کے بارے میں اس نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے کہ علمی اکتشافات کا رغبہ توسعہ اور کثرت سے وحدت کی جانب تھا جیکہ جدید دور میں تجزیے اور جزوی صہارت کو اہمیت حاصل ہے۔

وجهی کے فارسی دیوان کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسے فارسی زبان پر پورا عبور حاصل تھا اور وہ خود بھی اپنے آپ کو فارسی شاعری میں اساتذہ فن کا ہم پلہ سمجھتا تھا۔ لیکن نشنگاری کے لیے اس نے بھس زبان کا استخراج کیا وہ دکنی تھی۔ دکنی وجهی کی مادری زبان تھی۔ اور وہ بن سے مخاطب تھا ان کی مادری زبان بھی دکنی تھی۔ وہ ان کے مزاج اور ذہنی ساخت سے بھی بخوبی مافق تھا۔ دکنی زبان میں ادبی نشر کی روزایت موجود نہ ہونے کے باوجود سب رسائلی اعلیٰ درجہ کی نشری تصنیف پیش کرنا وجهی کی بلند پایہ تخلیقی صلایحیتوں کی دلیل ہے۔ اس میدان میں بنیاد رکھنے کے باوجود اس نے جو کمال اور صہارت رکھا ہے اسے اس کا پورا پورا احساس ہے۔

"بھکوئی اچایا بینا داول آخڑہ ہی استاد۔ لو عجائبِ نظام ہورا نشر ہے۔
جانو بہشت میں کا قصر ہے سلطنت پرستا ہے نور۔ ہر ایک یوں ہے یک جوہ، اسے پڑ کر جسے خط پایا جانو بہشت میں آیا۔"

سب رسائل میں وجهی کا نقش اول ہوتے کے باوجود کسی پختہ کار اور اعلیٰ تخلیقی صلایحیتوں کے حامل نشنگار کے نقش آخڑ سے کسی طرح کم نہیں۔

شاید بہت کم لوگ اس حقیقت سے را قف ہیں کہ قطب شاہی دربار میں زیادہ تر ایرانی شعراء اور ادیب ہی جمع تھے۔ باہشاہوں سے فرمت کی وجہ سے علمی رادی حلقوں اور عوام میں ان کی بڑی قدر دست رد تھی۔ دکنی شعر بالعلوم

در باروں سے دور اور خانقا ہوں سے قریب تھے۔ وہ جی اس ماحول میں ایک دل چسب کردار کی مثال پیش کرتا ہے۔ وہ صوفیوں اور خانقا ہوں سے بھی والستہ رہا اور دربار سے بھی۔

وہ جی بلاشبہ ایک اعلیٰ درجہ کا آرٹسٹ ہے اور اسے کمال فن کا پورا پورا احساس ہے وہ بیرون ملک (ایران) کے عالموں، ادیبوں اور شاعروں سے مرعوب نہیں ہے۔ کسی کا حسن، رنگ درود پ لباس فاخرہ اور امارات اس کی زندگی میں نہیں جھجتے۔ اسے اپنی صدلا جیتوں پر بھرپور اعتماد ہے اور ان پر بجا طور پر نازل ہے۔ وہ جی کے ایک فارسی شعر سے اس دور کے ماحول کی اور خود اس کی ایک صفات اور واضح تصویر فرہن میں ابھرتی ہے وہ کہتا ہے۔

بیچ کس را در نظر ہر گز نہیں آدم وجہیہ
مست وجاہل صور تم خوش در تکیر ما نہ ام

اس شعر میں وہ جی کا اشارہ در بارے کے ایرانی شعرا۔ اور باکمالوں کی طرف ہے یہ شاعر اور باکمال رنگ و نسل شائستگی اور تہذیب اور شان و شوکت کے اعتبار سے بظاہر کہتے ہی بلند سہی لیکن وہ جی جس حال میں ہے خوش ہے اور اپنے آپ پر فخر کرتا ہے۔ وہ کسی احساس کتری کا شکار نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا ظاہری رنگ روپ معیار زندگی ہم عصر ایرانی شعرا اور باکمالوں کے مقابلہ میں کمتر تھا وہ ان مہذب معاصرین کے مقابل جاہل یا گزار نظر آتا تھا لیکن علم و فقی کے معاملہ میں وہ ان سے پیچھے نہیں تھا بلکہ اپنی طرز کا منفرد اور اپنے پور کا بے مثال ادبی دیوار تھا اس کی تصنیف "سب رس" سے اردو نشر کو جوتا نگی "رس" میں مٹھاں اور نغمگی می ہے آج بھی کوئی اس سے منکر نہیں ہو سکتا۔

الطف حسین حالی

حالی نے خود اپنے بارے میں کیا خوب بات کہی ہے۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اس سے بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکان سے الگ

یہ شاعرانہ تعلیٰ نہیں ہے صاف اور کھلی حقیقت ہے۔ اُس دور میں حالی
کے نایاب مال سے گاہک بے خبر تھے اور اس کی قدر و قمیت سے پوری طرح واقف
نہیں تھے لیکن آج ادب کے بازار میں ان ہی کامال المول ہے۔ اس دور کے بہت
سے کھرے سکے کھوٹے ثابت ہو چکے ہیں اور حالی کے سکم کو بہت جلد کھرا مان
لی گیا۔ اور آج تک اسی سکم کا چلن ہے۔

حالی کے اثرات اردو شعر و ادب پر اتنے گھرے دیر پا اور دردوس ہیں کہ
اس کا تجویزی مختصر گفتگو میں ممکن نہیں۔ انھوں نے اردو ادب کے چین میں جو نئے اور صحبتند
پورے لگائتے تھے وہ آج چل دار تناور درخت ہے کھڑے ہیں۔ حالی وہ واحد شخص
ہیں جنھوں نے شاعری اور نثر کی کئی اصناف میں اپنی تخلیقات سے انقلاب پیدا

گیا۔ حالی سے پہلے یا ان کے بعد ہیں بعض ادبی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہوں نے شاعری اور نشری کسی صنف کو نیا ہمورڈیا اور اس کے دھارے بدل دیے۔ چنانچہ انہیں اس صنف کی حد تک امام مانا گیا لمیکن کسی کو عالی جیسا امتیاز حاصل نہیں چھپیں کہی شعری اور نشری اصناف میں امام اور بانی کی حیثیت حاصل ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی نہیں ہے کہ سادگی اور دردمندی حالی کی سیرت کی نمایاں خصوصیات تھیں اور ان کی تخلیقات میں یہ خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں اور حالی کا ادب حالی کی شخصیت اور سیرت کا عکس ہے۔ ہم تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ کون بالوں اور کتنی شخصیتوں نے حالی کو حالی بنایا۔ کس کے کہنے پر انہوں نے شاعری اور ادب کی خدمت کرنے پر توجہ دی۔ کن کن بزرگ اور ہم عصر قصیدوں نے ان کے ذوقی شعری کو نکھارا اور کس کی تحریک نے حالی کو اپنی طرف کھینچی۔ سب سے پہلے حالی کو غالب کی صحبت سے فیض اٹھانے کا

موقع ملا۔ جس وقت حالی غالب سے ملے اس وقت ان کی عمر ۱۸-۱۹ برس ہو گئی۔ حالی میں طبیعی میلان اور شاعری کا جوہر دیکھ کر غالب نے خلاف معمول انہیں فکرِ شعر کی صدراچ دی۔ حالی کی نظر اور سیرت کا کیا کہنا۔ اپنی کم عمری اور غالب کی غیر مقبولیت کے باوجود انہوں نے غالب کی عظمت اور برداشت کا صحیح اور بھروسہ اندازہ کر لیا تھا۔ حالی غالب کی شاعری کے دل سے معرفت تھے۔ حالی نے غالب سے زیادہ مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت سے فیض پالی۔ شیفتہ کے خیالات اور مذاق نے حالی پر بڑے گہرے اثرات چھپوئے۔

شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی کو بجا پورٹنٹ پک ڈپو میں ملازمت مل گئی۔ یہاں انگریزی کتابوں کے اردو ترجموں کی اصلاح کا کام ان کے ذمے تھا

ہال چاربرس کے قیام نے ادب کے پارے میں حالی کے خیالات - نظریات اور
وق میں بڑی تبدیلی پیدا کی۔ جب حالی لاہور سے نکلے تو انھیں مرستی کی تحریک
نے اپنی طرف کھینچی اور انھوں نے اپنی تمام صلاحیتیں اس تحریک کی نذر
دادیں۔

حالی کا نظریہ یہ تھا کہ علم و ادب اور شعر و حکمت کے ذریعوں کو اصلاح
باشرہ اور تہذیب اخلاق کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے یہی نہیں بلکہ استعمال
یا جانا چاہیے ۔ چنانچہ وہ جدید ادب کی تحریک کے علمبرداروں میں شامل ہو گئے۔
اُردو شعر و ادب کے ان ساقوں کو بدلنا جائے جو نئے حالات و تصورات سے اب
بُلی مطابقت نہیں رکھتے جو فرسودہ اور اڑکار رفتہ ہو چکے ہیں ۔ وہ ادیبوں شاعرین
اوادد کی علمی و ادبی سوسائٹی کو اس مصنوعی فضای سے نکالنا چاہیتے تھے جہاں
ان افکار کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔

حالی کی خوبی صرف یہی نہیں تھی کہ وہ خواب ہی دیکھتے اور منصوبے
تھے بلکہ حقیقی معنی میں عالم باختصار تھے اور اپنے خوابوں کی تعمیر اور اپنے منصوبوں
کیلیں کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہنا جانتے تھے ۔ انھوں نے ادب اور زندگی
و تعلق سے جو نیا سائنسی نظریہ اختیار کیا اُسے انھوں نے اپنے ادب اور
زندگی میں ایک مستقل اور باقاعدہ روایہ کی شکل دے دی ۔ اگر حالی کی تخلیقی
بان اعلیٰ پایہ کی نہ ہوتیں تو ان کی نظم و نشر سپاٹ اور موشن ٹھیکنی چیزیں بن کر رہ جائیں
اس پر شوری کو شوش کامگان ہوتا یکی معاشر اس کے بہتر ہکس ہے ۔ حالی اپنی دیگر
مہوصیات کے علاوہ ایک ایسے تخلیق کار بھی ہیں جن کی تخلیقی قوتوں کا سرچشمہ
تھے دور تک اور بہت بڑے پیمانے پر علم و ادب کی پیاسی اور سنگلار خزینے

کو سیراب اور شاداب کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح خود یہ بات بھی اردو ادب کو حالی کا
بہت بڑی دین بن جاتی ہے۔

شاعری کے بارے میں حالی کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں ان کا یہ قطعہ مفہومی
مدد دیتا ہے۔

اے شردل فریب نہ ہر تو تو عنسم نہیں
پر تجھ پر حیف ہے جونہ ہو دل گداز تو
صلحت پر ہو فلسفۃ عالم اگر تمام
بان سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جو ہمارے راستی کا اگر تیری ذات میں
تھیں روز گار سے ہے بے نیا ذ تو

حالی کے قیام لا ہو رکے دوران میں انہیں بیخاوب کے زیر اہتمام جو شاعر
معقد ہوتے تھے ان میں مصرعہ طرح کی بجائے شاعروں سے کسی خاص عنوان پر طبع آزاداً
کی درخواست کی جاتی تھی۔ حالی اور آزاد نے بھی ان شاعروں کے لیے نظمیں لکھیں
ان کی نظمیں اردو میں ایک نئی چیز تھیں۔

سرید کی تحریک سے والبستہ ہونے کے بعد حالی نے سنہ ۱۸۷۹ء میں
سدس حالی یا مدوجزر اسلام لکھی جو حالی کی شاعری کا بہت بڑا کارنامد ہے خلده
تا ثیر اور شاعرانہ درودندی کی ایسی مثال اردو کی کسی اور نظم میں مشکل سے ملے گی۔
اس نظم کو جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ایسی شہرت و مقبولیت بھی کسی اور نظم
کو نہیں نہ ہوئی۔ یہ نہ صرف اردو کی پہلی طویل نظر ہے بلکہ یہ پہلی مقصدی اور صلا
نتھر ہے۔ اس نظم سے اردو شاعری میں راقیت، افادت اور اجتماعیت کے

بچھانات آئے۔ اس نظم نے پہلی مرتبہ ریٹنابت کر دیا کہ شاعری سے اصلاح والوں کا کام کس طرح لیا جاسکتا ہے۔ قاری اس نظم کے کسی حصہ کو غیر دل چسب نہیں پایا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ساری نظم ایک ہی بھروسے ہونے کے باوجود حالی نے اس میں شروع سے آخر تک شعری آہنگ کو قائم رکھا ہے۔

اس نظم کے بعد حالی نے کمی اور قومی نظمیں لکھیں جن میں مہماجات بیرون اور چسب کی دادقابل ذکر ہیں۔

حالی نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور ابتدائی دور کی خوبی میں روایتی رنگ پوری طرح موجود ہے۔ زیان میں رنجیں اور دل کشی بھی ہے۔ لیکن حالی غزل کے مخالفین میں سے تھے اور قدیم رنگ سخن سے سخت بیزار تھے۔ چنانچہ الہور سے دری آنے کے بعد سنہ ۱۸۷۵ء سے انھوں نے نئے رنگ اور نئے انداز کی غزل لکھنے کا آغاز کیا۔ حالی کی جدید غزل اخلاقی اور اصلاحی خیالات کی ترجمان ہے۔

عام طور پر حالی نے غزل میں علامتوں سے اخراج کیا غزل کی علامتیں نئے تحریکوں اور تازگی اظہار میں حاصل ہو رہی تھیں۔ وہ اظہار کے لیے نئے اسکانات کی جستجو میں تھے کیونکہ غزل کی علامتیں سیر پر نقطہ پر بینچ چلی تھیں۔ ہر انفرادی تحریر پر وجہ علامتوں کے استعمال کی وجہ سے پڑانا اور فرسودہ معلوم ہوتا تھا۔

ہر دانشور کی طرح وہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے تحریکوں میں پیرائی اظہار کی تازگی ہو اور انداز بیان دوسروں سے مختلف ہو، ایک جیسے یا عام تحریر کو وہ انفرادی اظہار بیان کے ذریعہ شاداب بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے انفرادیت کے انہما کے لیے انھوں نے راست اظہار کا پیرائی استعمال کیا۔ حالی کی غزل سے روایتی علامتیں پوری طرح غائب نہیں ہیں۔ ماں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی غزلوں کا بنیادی مکملment کا ہے اپنے پیارے علاقوں

ہنسیں ہیں۔

حالی اردو میں جو یاد طرز کی سوانح نگاری کے باقی ہیں۔ حالی نے جن ہصولوں کو پیش نظر کر کر سوانحی تصانیف مرتب کیں اردو میں سوانح نگاری اسی راہ پر چل پڑی۔ حیات سعدی، یادگار غالب اور سریدی کی سوانح حیات جاوید کے بعد اردو میں ان شخصیتوں کی اس سے بہتر سوانح نہیں لکھی گئیں۔ اردو ادب میں یادگار غالب کے متعدد کاندھاء اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی اگر کوئی غالب کی حیات اور شاعری پر تلمذ اٹھانا چاہے تو یادگار غالب سے رجوع ہو سے بغیر کام نہیں چلتا حالانکہ اس وقت شاعر غالب پر صنایل اور کتابوں کا انبار لگ چکا ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا کیا ہے کہ جب سوانح نگار کسی ایسی بڑی شخصیت کی سوانح لکھتا ہے جو بقید حیات ہو یا جس سے مصنف کے تعلقات قریبی اور گہرے ہوں تو ایسی صورت میں سوانح نگار ایسے داقعات کے تذکرہوں کی بھرماڑ کر دیتا ہے جن میں وہ بھی مشرک ہے۔ اس کی کتاب تصویروں کا ایسا ایسہ بن جاتی ہے جس کی ہر تصویر میں مصنف خود موجود رہتا ہے۔ حالی میں انکسار کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہے اور خود نمائی سے تو وہ کوئی دور ہیں اس لیے وہ اپنی سوانحی تصانیف میں اہم اور ضروری داقعات میں بھی اپنے تذکرہ کو شامل کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔

حالی سے پہلے اردو میں تنقید کا وجود باقاعدہ فن کے طور پر نہ ہونے کے برابر تھا۔ تذکرہ یادگیر تحریروں میں جو تنقیدی اشارے اور تنقیدی خیالات ملتے ہیں اس سے تنقید کے اصل دینام کذا ممکن نہیں۔ مقدمہ شعرو شاعری تنقید کے میدان میں بہل لیکیں ہوتے اہم درجی کوشش ہے۔ حالی نے اپنے مقدمہ میں شعر کے میاں دیا ہوں ہر شاعری کے حصہ پر پہنچ لی ہے۔ شاعری کے پارے ہیں عام طور پر جو غیر صحت مند

تصورات پلے جاتے تھے۔ انہیں دور کرنے شاعری کے افادی پہلو کو واضح کرنے اور شاعری کو حقیقت اور زندگی سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے خیالات اور نظریات پر کافی خور و ذکر کے بعد اس کتاب میں ان سے استفادہ کیا ان کی تنقیت بسٹنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور آج تک اردو تعمید میں جواہرِ نقا ہوا ہے اس کتاب کا مر جوان منت ہے۔

سرسید نے پہلی بار رسائلہ ہنریب الأخلاق کے ذریعہ اردو زبان کو تو سبع دیتے اور اسے علمی و ادبی زبان بنانی کی شعوری کوشش کی تھی۔ وہ اردو نشر کے ایک ایسے طرز کو مستقل طور پر رواج دینا چاہتے تھے جو رواں، سلیمانی اور عام فہم ہوا اور رسمی ساختہ علمی و ادبی رسمتوں کے لیے موزوں بھی ہو۔ سرسید کے نفاؤں میں ان کی اسی کیک کو جس شخص نے سب سے زیادہ پروان چڑھایا وہ حالی ہیں۔ حالی نے اس طرزِ تحریر کے ایسے کامیاب نمونے اپنی نشر کے ذریعہ پیش کیے کہ سرسید کے مشن کی تکمیل ہو گئی۔ حالی کے کمی ہم عصر صاحب طرز ادیب تھے لیکن حالی کے طرز اور اسلوب ہی کو مقبولیت اور بقاء نے ندام حاصل ہوا۔

حالی نے شاعری کے لیے جو زبان استعمال کی ہے وہ بھی کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کی عامل ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان کے یہاں لکھنؤ کی شاعری کی طرح دل کشی، حُسن اور نفاست نہیں ملے گی لیکن یہی کمی ان کی شاعری کا حُسن ہے۔ حالی کی شاعری کو پڑھنے والا خواہ وہ دہلی کا ہو یا لکھنؤ کا۔ پنجاب کا ہر یا حیدر آباد کا بڑی آسانی سے شاعر کی بات سمجھتا اور سردھناتا ہے۔ حالی کی زبان پر کسی خاص علاقہ کی چھاپ نہیں ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو ساری اردو دنیا میں پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔

۱۰۲

اُردو زبان اور ادب کی زلپیں سنوارنے والوں میں بہت سے نام ملتے
ہیں میکن حالی کا چہرہ بار بار سامنے آتا ہے۔ اُردو زیان اور ادب کی ہمہ گمیری
کے لیے جس ادبی شخصیت نے سب سے زیادہ حصہ ادا کیا وہ بلاشبہ الطاف جیسی
حالی ہیں۔
۰۰

اسرارِ حق مجاز

تاریخ اردو ادب میں یوں تو کئی انوکھی، دل کش اور زنگار نگ شخصیتیں موجود ہیں۔ لیکن مجاز کی شخصیت کچھ اور ہی سہے بڑی دل کھلنے کی بھی اور بڑی دل لپھانے والی بھی۔ آزاد منش و صرکش بھی اور شاستری کی زندگی کا ایک پیکر بھی۔ انہوں نے زندگی میں بڑے تشیب و فراز دیکھے لیکن ہمیں حالات پر انھیں ردنہ نہ آیا وہ ہر نگ میں رقبہ سروسامان نکلے۔ اپنی بات کو مٹا دیا لیکن اپنے مزاج کی شکستگی اور ظرف کے با تکپن میں فرق نہ لئے۔ وہ ایک شاعر تھے اور انھوں نے ایک ایسے فن کار کی زندگی گذاری جو زندگی اور ضرورتوں سے بے نیاز رہتا ہے اور ماحول اور سوسائیٹی سے بہی بات کی توقع کرتا ہے کہ اسے اس کی تخلیقی صہلا ہیتوں اور خدمات ملے مخون و منصب عطا کیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہے۔

شهرت اور مقیومیت کی بلندیوں پر پہنچنے پر مجاز پسر در اور نشہ اکا ملک طاری ہوا لیکن عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد انہیں زندگی کے

تلخ حقائق کا اندازہ ہوا۔ یکے بعد دیگرے ناکامیوں کا مٹھہ دیکھنا پڑا ایک سخنروں اور ناکامیوں کے باوجود تلحی اور نفرت ٹلے کبھی دل میں راہ نہ کسی سے بدلہ اور انتقام لینے کی بجائے تمام غنوں کو شراب میں گھول دینے کی کوششی حجاز کی زندگی اور شخصیت ایک افسانہ ہے اس افسانہ کی تعمیر میں جو عوامل کا رفرما تھے وہ متفاہد اور ایک دوسرے سے متفاہد تھے۔ یہہ افسانہ رومنی اور دل کش صرزو ہے لیکن اس کا انجام بڑا تکلیف دہ اور حسرت ناک ہے۔

مجاز نے ۱۹۱۱ع میں بارہ بینکی کے ایک قصیہ لادولی کے مستوط درجہ کے زمین دار گھر انسنے میں جنم لیا۔ ان کی ریڑی نازد نعم کے ساتھ پر درش ہوئی۔ یوں تو خاندان میں سب ہی کے لاڈ لئے تھے مگر ماں کی تمام ترتیبیہ اور محبت کا مرکز بننے رہے۔ وہ اپنی ماں کی سب سے چہبیتی اولاد تھے۔ ماں نے ان کی دیکھ بھال اور پر درش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور آخری وقت تک اپنے اس بیٹے کو بے حساب پھیار دیا۔

اپنے وطن میں ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد مجاز لکھنؤتے اور اپنی آباد مانی اسکول سے میرٹ کے استحقان میں کامیابی حاصل کی۔ والد کا تبادلہ آگرہ پر ہو گیا تھا۔ اس لیے مجاز اصلی تعلیم کے لیے آگرہ پلے گئے اور اندر کی تکمیل تک آگرہ میں قیام کیا۔ مجاز کی ادبی زندگی کا یہیں سے آغاز ہوا۔ یہیں فاتح اور میکش اکبر آبادی سے ان کے مراسم بڑھے اور مجاز نے اپنی چند غزلوں پر فاتح سے اصلاح بھی طی۔

ست ۱۹۱۴ء میں مجاز علی گڑھ آئے۔ علی گڑھ پہنچنے سے کچھ پہلے ہی سے مجاذ

کی دل چسپیوں اور مصروفیات میں فرق آنے لگا تھا۔ تعلیم سے دل چسپی کرنے گئی تھی۔ شاعری اور دوسری مصروفیات میں عماراً دقت صرف ہونے لگا تھا۔ علی گڑھ میں سجادہ کا قیام پانچ سال تک رہا یہ دور مجاز کی ابتو زندگی کا بہت ہی تاب ناک رو سے۔ مجاز کی شخصیت اور شاعری کی تعمیر اور ارتقا، میں اسی درس گاہ اور اس کے ماحل نے بڑا گھبرا تڑپا۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ سے بیانے کیا۔

علی گڑھ کی پانچ سالہ زندگی میں مجاز کو جو مسٹریں میں۔ جو شکون میسر آیا گے بھر کجھی ایسا سکون وال طمیاناں انہیں نصیب نہ ہو سکا۔ ”لکھنؤ کی پانچ راتیں“ میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ مجاز علی گڑھ یونیورسٹی کے مقابلے تین شاعر تھے۔ ہوشی میں طالب علموں کے کمر دل پر، پروفسر دل کے کھر دل پر، مشاعر دل میں ہر جگہ وہ چھائے رہتے۔“ مجاز سراپا خلوص تھے۔ ہر ایک سے بڑی محبت سے ملا کرتے۔ برتاؤ پیار کا ہوتا۔ دوستی، شرافت اور علی نظری کے جو ادپنے تصورات انھیں درستے ہیں ملے تھے انھیں ابتدائی عمر میں گھر کے ما جوں نے جلا بخشی اور علی گڑھ کی زندگی نے نقطہ عروج پر پہنچا دیا۔ معلوم ہے۔ سادگی، معصومیت، حاضر جوایی، بر جستگی اور لمب دہجہ کی شکفتگی نے مجاز کی سیرت کو حُسن بخشنا اور انہیں سب کا تجویب بنادیا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں یہم۔ نے کی تعلیم نامکمل چھوڑ کر ملازمت کے سلسلہ میں وہ دہلی گئے جہاں وہ آل اندیار یہود کے اور درسالہ آواز شکر سب ایڈیٹر مقرر ہوتے۔ وہ بڑی امیدوں اور درخشاں مستقبل کی آرزو اور تلاش میں دہلی آئے تھے۔ لیکن ناساز گارحالت کی وجہ سے ایک سال بعد

ہی ملازمت چھوڑ دی۔ جب وہ دہلی سے لکھنؤداپس ہوتے تو وہ نہ صرف ملازمت کے چلے جانے کی وجہ سے مایوس متاثر تھے بلکہ عشق میں ناکامی کی وجہ سے دل پر ایک صدمہ کا بوجھ آٹھائے ہوتے بھی تھے۔

جس وقت مجاز لکھنؤ پہنچے اس وقت ملک میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ طور پر آغاز ہو چکا تھا اور اس وقت لکھنؤ اس تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ ڈاکٹر علیم، احمد علی، احمد شام حسین، سبط حسن، جذبی، سردار جعفری اور رشید جہاں وغیرہ اس وقت لکھنؤ میں جمع تھے۔ مجاز کی شاعری ابتداءی سے ترقی پسند و مجازات کی حامل تھی۔ اب انھیں نوجوان ترقی پسند ادیبوں کے اس گروہ کے ساتھ مل کر تحریک کے لیے کام کرنے کا موقع ملا۔ ترقی پسند تحریک کے ترجمان پرجم اور نیا ادب کی ادارت میں مجاز، سبط حسن اور سردار جعفری کے ساتھ شامل تھے۔ مجاز اس دور میں اردو کے محبوب ترین شاعر تھے بڑے سے بڑے اشعارہ ان کے ہاتھ رہتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں جگ کے سوا کسی اور شاعر کو مشاعر دل میں اتنی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ مجاز کی ان کامیابیوں میں شاعری کے علاوہ ان کی پرکشش اور دلاؤری شخصیت کو بھی دخل رہا ہے۔ لیکن بہار کے یہ دن جلدی ختم ہو گئے اور مجاز کی زندگی خزان کے تکلیف دہ دور میں داخل ہو گئی وہ پہلے ہی سے دل پر چوٹ کھاتے ہوئے تھے اب حالات کی ستم ظریفی اور دوستوں کی ناہربانیوں نے دل ہی کو نہیں دماغ کو بھی متاثر کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں مجاز پر جنون کا پہلی بار دورہ پڑا۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء

میں دوسرा اور تیسرا دورہ پڑا۔

مجاز نے ناگا میوں، محرومیوں اور سخت ذہنی اذیتوں کے بعد شراب میں پناہ ڈھونڈی اور زندگی کے آخری دنوں میں شراب ہی مجاز کا سہارا تھی اور ان کی سب سے بڑی کمزوری، شراب کی کثرت نے مجاز کے جسم کو کھو کھلا اور دماغ کو شل کر دیا اور آخر ایک دن اسے خیس ہم سے چھپن لیا۔ انگریزی ادب کے جواں سال تھا کیٹش اور شیلے کی طرح ہندوستان میں لغمہ سنج اور چونکا دینے والی لے رکھنے والے اس محبوب شاعر نے صرف ۲۴ برس کی عمر میں ہبہ شیر کے لیے انکھیں بند کر لیں۔

پہنی ماں اور بہنوں کے لادلے، عوام کے محبوب و مقبول شاعر، ہر حلقة اور گروہ کے منظور نظر کا انجام بردا حسرت ناک تھا۔ آخری دنوں میں ان کی کثرت شراب نوشی، دیگر بے اعتدالیوں اور بے تکمیل حركتوں کو دیکھ کر ان کے بزرگ ان کی اصلاح کے لیے دعا کرتے۔ قریبی دوست احبابِ محبت سے نصیحتیں کرتے ہوئے احتی کو سخت سست کہنے پر بھی محبور ہو جاتے۔

اللی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دانے کا کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
مجاز کے انتقال کے دوسرے روز تعزیتی جلسے میں عصمت چھتاں نے اپنی تقریبیں کہلہ

”میں نے اکثر مجاز کو اس کی بعض عادتوں پر ڈالنا ڈا درکبھی غصہ میں کہا“ اس سے بہتر ہے کہ مجاز تم مر جاتے“، مجاز نے جیسے منہ پر طامنیہ مار دیا اور کہا ”لوہ میں مر گیا تم اس کو اتنا بردا کام سمجھتی تھیں۔“

بیسویں صدی کے تیسرا سے اور چوتھے دہے میں اردو کو جو شاعر طے ان میں مجاز بلashere اہم اور قابل قدر شاعر ہیں یوں تو انھوں نے تقریباً چھپیں“

بوسی شاعری کی لیکن در حقیقت ان کی شاعری کی عمر پارہ تیرہ سال (ستہ مرتا شکر) ہے جس میں وہ شاعری کی جانب پوری طرح توجہ دے سکے۔ آخری چند سالوں میں وہ بالکل خاموش رہے۔ فکر سخن نہ کرنے کے اسباب پوچھنے پر جواب دیتے۔ "شعر کی دیوبی مجھ سے روٹھ گئی ہے" "مختصر و صہ میں مجاز کو بکامیابی نصیب ہوئی اور قابلِ رشک ہے۔ ایسی کامیابی ان کے معاصر شعرا میں کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔"

ترقی پسند تحریک سے والبستہ شاعروں میں مجاز کو نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ مجاز کو فیض، مخدوم اور سردارِ عجمی پر اس اعتبار سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ مجاز کی شاعری نے ترقی پسند اقدار کی تشکیل میں حصہ لیا جبکہ ان شاعروں نے ترقی پسند شاعری کے اپنے اور کامیاب نہ نے بعد میں پیش کئے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند شاعروں میں سب سے پہلے مجاز کا شعری مجموعہ "آہنگ" ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ جبکہ فیض اور مخدوم کے شعری مجموعے بہت بعد کو شائع ہوئے۔

نغمگی، مٹھاس اور رسم مجاز کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ لہجے کا دھیما پن، نرمی اور کھلاوت انھیں دوسرے معاصر شعرا میں ایک منفرد مقام بخشتی ہے۔ مجاز کو فن پر ریاضی قدرت حاصل ہے۔ ان کی زبان میں حلاوت اور نزاکت کا احساس ملتا ہے۔ ان کے باہم نادر اچھوتی تشبیہات اور ہمتوں ملتے ہیں ان میں تخلیقی شان نمایاں ہے۔

مجاز تے عام طور پر سیاسی پر دیکنڈا در نظرہ بازی سے پرہیز کیا۔ واقعی اور ہنگامی مسائل پر لکھی گئیں چند نظموں کو چھوڑ کر ان کی شاعری فکر اور فن کا حصہ اور خوب صورت امتزاج ہے۔ مجاز کے فن اور شخصیت میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

ان کی شاعری اس دور کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کی تصور پیش کرتی ہے۔ سماجی زندگی کے مسائل اور الحسنیں کے ساتھ ہی ساتھ مجاز کی شاعری میں اس دور کی نوجوانی کی محرومیوں، درد و کرب اور احساسات کی سچی ترجیحی بھی ملتی ہے۔

فرقہ گورکصپوری نے مجاز کی شاعری کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے۔

پورہ حاضر کی شاعری میں مجاز ایک عجیب و غریب مظہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک بان کی طرح چھپڑا اور فضائی بلندیوں میں پھول سی جگہ مگاتی ہوئی چنگا ریاں بکھیر کر چشم زدن میں بچھ گیا۔ لیکن یہ چنگا ریاں اس کے مختصر مجموںہ کلام میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہیں۔ ان کی جگہ چھپڑا ہمیں زندگی کی راتوں کو روشن کرتی ہیں گی؟

رات اور ریل، آوارہ، نذر علی گڑھ، عیادت، اعتراف اور فکر مجاز کی اہم اور کامیاب نظمیں ہیں۔ مجاز بیانی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن ان کی چند غزلیں ایسی ہیں جو قاری کو فوراً اپنی جانب متوجہ کر دیتی ہیں ان اشعار میں زندگی اور عشق کے عام اور سادہ تجربے خوب صورت اور شاعرانہ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ جن کی تاثیر سے انکار نہیں۔

غرض مجاز کی شاعری اور دل میں ایک قابل قدر اضافہ ہے جو کئی خصوصیات کی وجہ سے دیر پا اور مستقل حیثیت کی حامل ہے۔ مجاز کی جوانمرگی اور دل کی جدید شاعری کے لیے ایک سانحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۷، ۳۳ سال کی مختصر تر میں مجاز کی جواہر رہی۔ اگر اس کا فطری اور منطقی ارتقا جاری رہتا اور مجاز حادث نماز کے اثر سے ذہنی اور فکری طور پر بخوبی ہو کر اتنا جلدیوت کے مذہب میں پہنچتے تو یہ توقع انکی جا سکتی تھی کہ جدید اور ترقی پسند شاعری کو اس کا بڑا اور نہادنده شاعر میں جانا۔ ۵

محمد محبی الدین

"سرخ سورا" اور "گل تر" کے شاعر محمد مسماطِ رقص "چھوڑ کر چلے گئے۔ اس سالنامہ کو ۲ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں لیکن آج بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ بسماطِ رقص پر ان کی جگہ خالی ہے۔ اس گل تر کے رنگ و بو کی آج بھی تلاش ہے۔ مگر کہیں نہیں ملتی۔ صرف یادوں کے چین میں بہکتی ہے۔ محمد مسماط ایک شاعر اور فن کار ہی نہیں کیونٹ وڑیدیونیں لیڈتے تھے۔ سیاسی رہنمای تھے اور اس کے علاوہ بھی بہت بچھتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد وڑیدیونیں تحریک نے بھی ان کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی ہوگی۔ سیاست نے بھی انھیں بار بار یاد کیا ہو گا۔ زندگی کے دوسرے شعبے بھی انھیں آزادیتے رہے ہوں گے۔ لیکن جو خلا— مکمل خلاوہ بہ حیثیت شاعر اور فن کار کے چھوڑ گئے ہیں بُر نہیں ہو سکتا۔ اس بسماط پر کوئی دوسرا اہرہ ان کی جگہ نہیں لے سکتا۔ محمد مسماط کی ہمہ پہلو شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں شاعر اور فن کار کا دل بھانے والا پہلو تھا۔ اس تخلیقی فن کا رنے جو حُسن کار بھی تھا اپنی بے نیاہ تخلیقی

تو توں کے ذریعہ اپنی شخصیت میں بھی ایسے رنگ بکھیرے تھے۔ ایسے خط لکھنے تھے ایسے زادیے بنائے تھے اور زنگوں کا ایسا خوب صورت امتراج کیا تھا کہ اس کی شخصیت بھی اس کی شاعری کی طرح دلاؤ نہ کھانی دیتی تھی۔

مخودم اردو کے اُن معنوں سے چند شاعروں میں سے ایک ہیں جنہیں اپنے ڈھنی میں بے حساب پیارہ ملا اور غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ جس شخص نے اقتدار اور دولت کے بغیر حیدر آباد میں دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ وہ مخدوم ہی۔
حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

کہنے والے محبوب شاعر مخدوم نے اعلیٰ انسانی اقدار سے پیارہ اور سچی انسان دوستی کے باشناکوں کو پینا بنا یا۔ مخدوم کے لیے حیدر آباد میں جو بے پناہ محبت اور عقیدت پانی جاتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

مخدم نے اپنی ساری زندگی ناموافق حالات کے خلاف جنگ کرنے اور یہیم حمد و جہد کرنے میں گزاری۔ لیکن ان پیچیدہ اور پُر خار را ہوں سے گزرنے کے باوجود زندگی بھراں کی زندہ دلی، شوخی اور ترزاں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ نہ صرف انھیں مستقبل پر آخر وقت تک تیکی رہا بلکہ دوسروں کا حوصلہ بھی ہمیشہ بڑھاتے رہے۔

حیدر آباد کی سیاسی، ادبی اور تہذیبی زندگی سے مخدوم کا اتنا قریبی اور گہرا تعلق رہا ہے کہ دونوں کا تصور علیحدہ غلطیہ مشکل ہے۔ مخدوم کے انتقال سے حیدر آباد کے ایک دور کا خاتمه ہوا۔ ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی پرانوں نے بڑے گہرے اور درپر پانقتوش چھوڑتے ہیں۔ مخدوم کی شخصیت اور اس کے سحر سے مبہم ہوئے۔ کیا درست، کیا دشمن۔ ایک بار ان سے ملنے والا دوبارہ ملنے کا ارز دمنہ ہوتا۔ مخدوم

کی شخصت میں بلا کی پچک تھی جہاں انھوں نے بے شمار موقعوں پر جلوسوں اور منظاہروں کی قیادت کی۔ انھیں قریب سے دیکھنے والوں نے کئی بار بچوں کے ساتھ کھیلتے بھی دیکھا ہے۔ ہم انھیں ادبی اور سیاسی جلسوں میں پرمغزا و جو شیلی تقریریں کرتے اور مشاعروں کو لُٹتے بھی دیکھا ہے۔ مخدوم نے عقل کو دل کا پاساں بنایا ہے تو کبھی کبھی دل کو تنہا بھی چھوڑتا ہے۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہونے کے باوجود ان کی شخصیت کا ہر پہلو ایک علمی درجہ اور منفرد نوعیت کا عامل ہے۔

اس مردانزادے نے اپنی ساری زندگی دوسروں کے لیے وقف کر دی تھی۔

تیاگ، ایثار اور قربانی کو زندگی کا شعار بنایا۔ ماحول کی بے حسی اور لوگوں میں ایثار اور قربانی کے جذبہ کا فقدان دیکھ کر کہتے ہیں۔ ۷

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پلچھلتا ہی نہیں
سوم بن جاد پنگھل جاد کم کچھ رات کے

مخدوم نے آسودہ حالی اور مادی آسائشوں کی بجائے فقر و فاقہ کی زندگی گزاری۔ اُن کی زندگی سخت آزمائشوں سے گزری اور انہوں نے سخت صعوبتیں برداشت کیں لیکن قدم کبھی نہیں ڈگنگا رہے۔ مسکراتے ہوئے خذہ پیشانی سے ہر مصیبت جھیلی۔ انھوں نے زندگی سے بھر لوپ انداز میں محبت کی اور دوسروں کو زندگی سے محبت کرنا سکھایا۔

مخدوم کو ان کی محنت، صلاحیت اور خدمات کے عوام جو معاوضہ ملتا رہا ہے حد تکیل اور غیر متناسب تھا۔ ان دونوں طبق اور قوم کی خدمت کو لوگوں نے منفعت بخش پیشہ بنالیا ہے۔ لوگ خدمت کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور خدمت کا بہانہ بناتے کہ اپنی اور اپنے افراد خاندان کی زندگی اس سوار لیتے ہیں۔ مخدوم نے

ملک اور قوم کی بے لوث خدمت کی۔ راد میں سخت مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے رکنے اور مرٹ کے پیچھے دیکھنے کی تک زحمت گوارانہ کی۔ دم آخر تک اعلیٰ سبقاً صد کے حضول کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ زندگی کی اعلیٰ اور مشتبہ اقدار پر انھیں جو ایقان تھا وہ کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ مخدوم ایک علامت تھے نیکی اور اچھائی کی۔ مخدوم کے کردار کا ایک اہم وصف انسان دوستی اور محبت ہے۔ وہ انسانوں کے فرق اور امتیاز کو نہیں مانتے تھے۔ فرد کے لیے اپنے دل میں جذبہ اخلاص رکھتے تھے اور تعصب اور تنگ نظری کے دشمن تھے وہ ہمیشہ کمزور لوگوں کا سہارا بانے رہے اور کبھی کسی بااثر اور مفہود شخصیت سے ممتاز نہیں ہوئے۔ اخلاقی جمادات، بے باکی ذاتی و شخصی مرفار سے اجتناب اور کردار کی مضبوطی سے مخدوم نے سب کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی تھی۔ ان کے خیالات اور نظریات سے اختلاف کرنے والے اور غوامی اور ادبی زندگی میں انہیں اپنا حرف سمجھنے والے بھی شخصی طور پر ان کا احترام کرتے تھے۔

ادبی محققوں، مشاعروں اور دیگر تہذیبی تقاریب میں لوگوں کی آنکھیں مخدوم کو دھونڈا کرتیں۔ ان کی غیر موجودگی سے لوگ بے چین ہو جاتے۔ کچھ دیر بعد مخدوم ہشاش بشاش، ہنستے مسکراتے ادھر آتے رکھائی دیتے تو سب کی نگاہیں ان کی جانب اٹھ جاتیں اور یہ جان محفل، محفل کی رونقی برٹھا دیتا۔ جب وہ نغمہ سرا ہوتے تو سب کے چہرے کھل اٹھتے۔ ان کے اشعار کی نغمگی جب ان کے ترجمے سے ہم آہنگ ہو جاتی تو ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی۔ سماں بندھ جاتا۔ حیدر آباد میں کئی بار مشاعروں میں بیرون ریاست کے ممتاز مہماں شعر سے زیادہ دل جیپی کے ساتھ مخدوم کو سُنا گیا ہے۔ کبھی وہ سخت المفظ میں اپنا کلام پڑھنا چاہتے تو سامعین انھیں اسکی

اجازت نہ دیتے وہ توہین شہ ان کا کام ان کے سخن انگریز ترجم میں سننا پسند کرتے تھے۔ مخدوم اپنا کام ڈوب کر سنایا کرتے تھے۔ ان کے پڑھنے کا انداز بے حد متاثر کرن تھا۔ سننے والوں کی طبیعت سیریز نہ ہوتی تھی۔ سامعین کو اکثر پرانا کام سننا پڑتا مگر ہر بار وہ کئی دفعہ سنی ہوئی نظموں اور غربوں کوں کرایک نیا لطف لے جاتے۔

مخدوم بلاشبہ ایک بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ فن کا رانہ حسن کے بڑے خوب صورت اور اہلی نسونے ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ابتدائی شعری تخلیقات ہی کے ذریعہ ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور بہت سے دیدہ درود نے اسی وقت اندازہ کر لیا تھا کہ حیدر آباد مستقبل قریب میں اردو شاعری کو ایک اور باکمال شاعریستے والا ہے۔

مخدوم نے اس صدی کے تیسرا سے دہے کے بعد سماں شاعری کا آغاز کیا اور ان کا پہلا مجموعہ "سرخ سوریا" تقریباً دس سال کے فکر سخن کا نتیجہ ہے۔

اس شعری مجموعہ میں روز مانی اور انقلابی نظموں کے علاوہ ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن میں رومانی اور انقلابی شاعری کا امترانج پایا جاتا ہے۔ پہلے مجموعہ کی اہم نظموں میں جنگ، مشرق، حوالی، انتظار، انقلاب، اندھیرا، زلف اور اسٹالنی قابل ذکر ہیں۔

سرخ سوریا کی اشاعت کے بعد چونکہ مخدوم عملی سیاست کے میدان میں داخل ہو گئے تھے۔ اس لیے ایک طویل عرصہ تک وہ شاعری کی جانب توجہ نہ دے سکے۔ اس طویل خاموشی کے بعد انھوں نے جو پہلی نظم لکھی وہ آزاد نظم قید ہے جو وہ سے جموجھ کل تر کی پہلی نظم ہے۔ انھوں نے "چارہ گر" جوان کی ایک اہم نظم ہے ۱۹۵۶ء میں لکھی۔ اس نظم سے مخدوم کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس نظم کے بعد انھوں نے بڑی اچھی اور حسین نظمیں لکھی ہیں جن میں چاند تاروں کا بن، قص، سناٹا لخت جگہ، وقت بے در میجا اور وصال شامل ہیں۔ ان کی نظم "چاند تاروں کا بن" آنندی پر لکھی گئیں بہترین نظموں میں اپنی منفرد شان رکھتی ہے۔ اس نظم کا کہیں تو میں

بہت پھیلا ہو ہے لیکن مخدوم نے اختصار سے کام نیتے ہوئے بڑی
مکمل اور جامع نظر لکھی ہے موسم کی طرح جلتے رہے ہم شہید دل کے تن
نات بھر جبلماقی رہی شمع صبح دلن
رات بھر جگہ کا تارہ چاند تاروں کا بن

مخدوم کے دوسرے دور کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اشارت کا
عضر نہیں ہے اور بالواسطہ اور مشاعرانہ اظہار کو انھوں نے بڑی اہمیت
دی ہے۔ احساس جمال، غصہ اور موسيقیت کا عنصر ازا بذارتا انتہا ان کی شاعری
میں موجود ہے۔ یہی خصوصیات مخدوم کو ان کے ہم عصر شعراء میں ممتاز و منفرد مقام
عطایا کرتی اور ان کے اشعار کو دادا می حیثیت بخشتی ہیں۔

مخدوم نے تقریباً ۲۵ برس تک نظر لکھنے کے بعد غزل کی صنف کی جانب توجہ کی اور
تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی چند نہایت دل کش اور عمده غزلوں کے ذریعہ پسے آپ کو
ایک کامیاب غزل گوش اغاثت کیا۔ غزل کی صنف کے لوازم اور تقاضوں کا انھوں
نے پورا پورا الحاظ رکھا اور بے اعتدالیوں سے پر ہیز کیا لیکن اس کے باوجود ان
کی غزل روایتی غزل سے مختلف ہے، فکر و اسلوب کی تازگی نے ان کی غزل کو
شکفتگی، دل نشینی اور دل آویزی بخشتی ہے۔ سماجی اور سیاسی مسائل کو راست
طور پر بیان کرنے کی بجائے غزل کے خصوص اشاروں اور کنایوں میں بڑی مہارت
کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس طرح صرف چند غزلیں کہنے کے باوجود نئی غزل کے
سرمایہ میں اضافہ کیا۔

غرض یہ کہ مخدوم نے پر ہیت انسان، رہنا اور شاعری شخصیت
کے ایسے گھرے نقوش چھوڑے ہیں کہ انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ انھیں ہم سے

جُدا ہونے ۲۰ سال کی مدت ہوئی ہے لیکن جب کسی محفوظ میں ان کا تذکرہ ہوتا ہے تو ردش آنکھوں یا دل آویز ٹیسٹم اور ہرشاش بشاش چہرے کے ساتھ ان کی تصویر اور پرچھا میں ابھرتی ہے اور پھر آنکھوں کے سامنے ان کی کئی تصویریں گھوم جاتی ہیں۔ مخدوم کی یاد تازہ پھولوں کی ایک مرہک ہے جس سے دماغِ معطر ہو جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ ہم ان کی مادی رفاقت سے محروم ہو گئے ہیں لیکن وہ اپنے پیچھے قسمی اثاثہ چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی شخصیت کے گھرے نقوش اور شاعری کا بیشتر حصہ زندہ اور باقی رہنے والی چیزوں ہیں ۱

بزم سے دُردہ گاتارہ تہہ تہہ
سوگی ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے